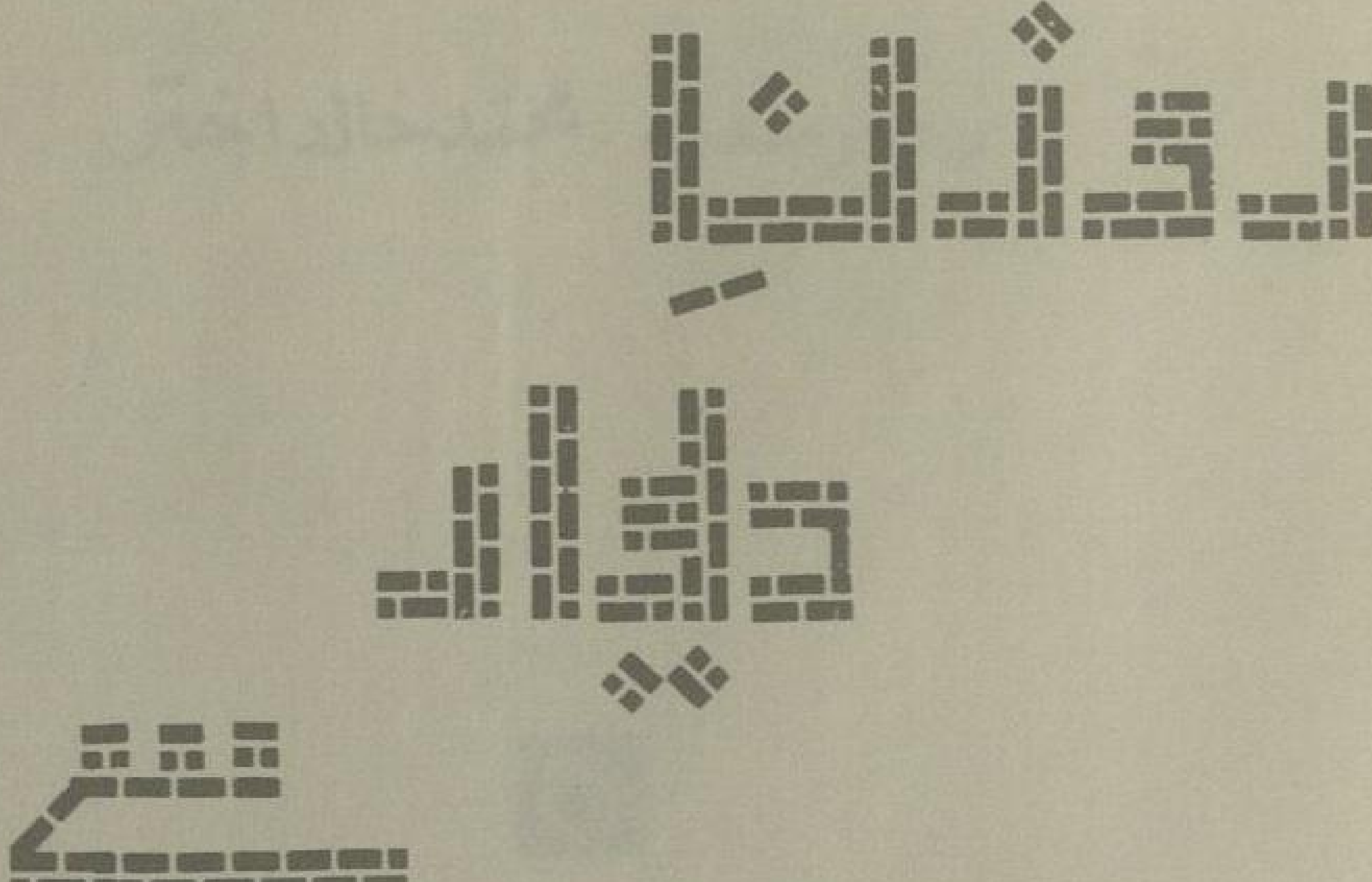

روزنِ دیوار سے
عطاء الحق قاسمی







روزنِ دیوار سے

عطاء الحق قاسمی

انتخاب و مقدمہ : محمّد خالد اختر

مطبُوعات ـــــ لاہور

مصنّف : عطاء الحق قاسمی

ناشر : خالد احمد۔ نجیب احمد

طابع : محمد طفیل

مطبع : نقوش پریس

اردو بازار۔ لاہور

کتابت : اطہر ضمیر ، نعمت اللہ خاں بابر

بارِ اول : ۱۹۷۸ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : بیس روپے

سرورق : غلام مصطفےٰ

پیارے ابا جی

پیرزادہ محمد بہار الحق قاسمی

کے نام

عطاء الحق قاسمی کی تحریر یلک کے پچھلے تمام مزاح نگاروں اور بالخصوص کالم نویسوں کے اندازِ تحریر کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے انہوں نے مزاحیہ کالم نویسی کو ایک نئی زندگی اور توانائی بخشی ہے ان کی تحریریں شگفتہ، منفرد اور متنوع ہیں۔ وہ مزاح کے روایتی تلازمات سے کام نہیں لیتے اور نہ مضحک واقعات و کردار کے پیچھے اپنے کان پر قلم رکھ کر دوڑتے ہیں۔ بلکہ ان کی شخصیت میں جو مزاح رچا بسا ہوا ہے وہ اسے کام میں لا کر جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اسے بڑی آسانی سے مسخر کر لیتے ہیں اور اس کی ہیئت بدل ڈالتے ہیں۔

نصراللہ خاں

عطاء الحق قاسمی دوسرا نوجوان مزاح نگار ہے، جو ہمیں علمائے کرام خاندان کی دین ہے۔ ان سے پہلے جناب احمد ندیم قاسمی نے بھی یہ ثابت کیا کہ متانت اور ثقاہت کے بے آب و رنگ صحرا میں بھی لالۂ صحرائی اس شان سے شگفتہ ہوتا ہے کہ آس پاس رنگ و بُو کی ایک موج لہراتی محسوس ہوتی ہے۔ احمد ندیم نے مزاحیہ ادب میں یہ روایت قائم کی کہ اسے طنز و تشنیع سے دور رکھا اور عطاء الحق قاسمی نے طنز و مزاح کو اس طرح شیر و شکر کرنے میں کامیابی حاصل کی کہ ان کے فقرے دو دھاری تلوار کا حکم رکھتے ہیں زمانہ جس رفتار سے چل رہا ہے اس رفتار میں رُستاخیز کا عالم پہلے بھی ہنسی مذاق کے موضوع پیدا کرتا رہا ہے اور اب کہ اس کی رفتار میں تیزی بھی آرہی ہے عطاء الحق قاسمی کی نظر بھی اسی تناسب سے اس کا تعاقب کر رہی ہے!

وقار انبالوی

ترتیب

ابتدائیہ

میرے ادیب دوستوں نے پورے خلوص سے مجھے مشورہ دیا تھا کہ اپنے کالموں کا انتخاب سب سے آخر میں شائع کرنا۔ اگر تم نے یہ کتاب آغاز ہی میں شائع کی تو ساری عمر کے لیے تم پر کالم نگار ہونے کا "ٹھپّہ" لگ جائے گا۔ میرے یہ دوست ٹھیک کہتے تھے لیکن غلط میں بھی نہیں تھا کہ میرا کہنا تھا میں کالم نگاری کو بھی ایک تخلیقی عمل سمجھتا ہوں۔ میرے کالم میری جائز اولاد ہیں چنانچہ میں انہیں نہ تو عاق کر سکتا ہوں اور نہ ان کے ساتھ غیر مساوی سلوک کر سکتا ہوں۔ یوں بھی جو باتیں میرے کسی ادبی "فرمے" میں فِٹ نہیں ہوتیں وہی باتیں میں یہاں بڑی آسانی سے ہلکے پھلکے انداز میں کر کے اپنا کتھارسس کر لیتا ہوں اور پھر سکھ کی نیند سوتا ہوں۔ سو میں نے ادیب دوستوں کے مشوروں کے باوجود آغاز ہی میں منتخب کالموں کی یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کر دی ہے اور اس میدان میں بھی "جو کام ہوا مجھ سے وہ رستم سے نہ ہو گا" کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ بہت سے "یارانِ تیز گام" نے مجھ سے بہت پہلے یہ "محمل" جا لیا ہے، میری اگر کوئی حیثیت ہے تو وہ غبارِ راہ کی ہے!

لگے ہاتھوں اگر میں اپنے منتخب کالموں کے اس مجموعے کے بارے میں دو ایک باتیں مزید کرتا چلوں تو غالباً اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔ مثلاً یہ کہ میں نے ہر کالم کے آخر میں اس کالم کی "تاریخ پیدائش" بھی درج کر دی ہے۔ نیز اس

کتاب میں موجود ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک کے کالموں کو ترتیب بھی تاریخ وار ہی دیا ہے تاکہ اس عہد کی مربوط فلم دیکھنے اور سمجھنے میں آسانی رہے ۔ ایک بات مجھے یہ بھی کہنی ہے کہ میرے کالم اگر کہیں کالم نگاری کی طے شدہ تعریف پر پورا نہ اتریں، بلکہ اپنی تکنیک کے باعث ان حدود کی خلاف ورزی اور کسی دوسری صنف کے ساتھ تانک جھانک کرتے پائے جائیں تو براہِ کرم انہیں کچھ نہ کہا جائے بس جوانی کی بھول سمجھ کر معاف کر دیا جائے! نیز یہ کہ میرے خوشنویس دوستوں اطہر اور بابر نے جس محبت سے کتابت کی ہے، اس محبت سے میں پروف نہیں پڑھ سکا، چنانچہ جہاں کہیں آپ کو کتابت کی کوئی غلطی نظر آئے، یہی سمجھیں کہ میں نے لفظوں کے "الٹ پھیر" سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ آخر ہمارے ہاں مزاح نگاری میں ایک سکول یہ بھی تو موجود ہے!

اوپر کی سطور میں میں نے کہا تھا کہ میں اپنے کالموں میں اپنا کتھارسس کر لیتا ہوں اور پھر سکھ کی نیند سوتا ہوں تو آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اس کے لیے میں اپنے کالموں کے علاوہ جناب مجید نظامی کا بھی ممنون ہوں کہ ایک تو مجھے باقاعدہ کالم نگاری کی راہ پر ڈالنے والے وہی ہیں اور دوسرے بسا اوقات اخبار کی پالیسی کے مقابلے میں وہ میرے کتھارسس کا زیادہ خیال رکھتے ہیں، سو میں ان کا احترام ہی نہیں ان سے محبت بھی کرتا ہوں!

اور مجھے جناب محمد خالد اختر کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ میرے کالموں کا انتخاب کر کے زیرِ نظر مجموعے کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا، بلکہ اس پر مقدمہ بھی لکھا۔ یہ دونوں باتیں میرے لیے کسی طور بھی ایک اعزاز سے کم نہیں ہیں۔ تاہم اس انتخاب میں تھوڑا بہت انتخاب میرا اپنا بھی شامل ہے چنانچہ قارئین جن کالموں سے بدمزہ ہوں، سمجھ لیں کہ "ایں ہمہ آوردۂ من است"!

عطاء الحق قاسمی

۱۱ر ونڈسر پارک
اچھرہ ——— لاہور

۲۶ر فروری ۱۹۷۸ء

عرضِ حال

جسے آپ دیباچہ وغیرہ بھی کہہ سکتے ہیں

بڑھیا مئے ناب کو عشق پیچے کے گچھے کی حاجت نہیں ہوتی اور عطاء الحق قاسمی کی یہ تحریریں کسی کی تعریف کی محتاج نہیں۔ کہنے کو تو یہ سب کی سب اخباری کالم نویسی کی صف میں آتی ہیں۔ ایک دن کی زندگی پانے والی وقتی تحریریں، مگر ان میں اتنی شگفتگی اتنی انبساط انگیزی ہے، ان کا اسلوب اتنا قدرتی، اتنا روشن ہے کہ میری رائے میں (اور اس کے دوسرے پڑھنے والوں کی رائے میں) وہ ادب کے قریب آجاتی ہیں ان میں سے چند ایک تو ادب پارے ہیں۔ اعلیٰ معیار کی طنز اور ظرافت کے نثری ٹکڑے جنہیں آسانی سے بھلایا نہیں جاسکتا۔ بہت سے لوگوں کو اس کے "روزنِ دیوار سے" کے کالم، ٹوٹے ای طوطے" "ہٹ ہیرو، کامیڈین اور اب ولن" ابھی تک یاد ہیں اور اس کی نگارش بالعموم اتنی یکسانی سے اچھی اور مسرت بخش ہے کہ اس کے بہت سے کالم جن کے عنوان اب یاد نہیں رہے اس لائق ہیں کہ انہیں محفوظ کرلیا جائے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے یہ اخباری کالم جنہیں دوسرے دن پرانا اور باسی ہو جانا چاہیئے اس لیے کھلے ہوئے اور تروتازہ ہیں اور انکی آب وتاب اس لیے باقی ہے کہ ان کے لکھنے میں اس نے اپنی ذہنی اور جذباتی کاوش کا رنگ بھرا ہے اس کے کم ہی کالم ایسے ہوں گے جن کے بارے میں یہ

کہا جا سکے کہ انہیں روا روی میں گھسیٹا گیا ہے یا الفاظ جگہ بھرنے کے لیے استعمال کئے گئے ہیں ان کے کالموں میں سلجھی ہوئی شوخ، پُرظرافت باتوں کا مزہ ملتا ہے اور وہ جو سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی تحریر کا لکھنا آسان ہے ذرا اس طرز پر لکھ کر تو دیکھیں صاف اور سچا فقرہ لکھنا آسان کام نہیں اور وہ کاوش کے بغیر کوئی ایسا فقرہ نہیں لکھ سکتا۔ اور پھر عطا کے کئی کالم پڑھنے کے بعد ہم کچھ دیر سوچ میں پڑ جاتے ہیں یہ نہیں کہ وہ محض ہنسی مذاق کی باتیں ہوں اس کا دل گداز ہے، انسانیت کے لیے دھڑکتا ہوا۔ اور یہ دھڑکن جھوٹا پوز نہیں۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہ کالم نگار ہے تو وہ عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور ہمارے دوسرے بڑے اردو کے کالم نگاروں کی روایت کو نہایت امتیاز سے نبھاتے ہوئے ہے اور اس میدان میں اس کے پیشرو اس پر فخر کر سکتے ہیں۔ چراغ حسن حسرت جو اردو ونثر کا بادشاہ تھا زندہ ہوتا تو اس کی پیٹھ ٹھونکتا اور خوش ہوتا۔

میں عطا سے پہلے پہل ایک سفر نامہ نگار کی حیثیت سے روشناس ہوا۔ اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ فکاہیہ کالم بھی لکھتا ہے اور اس کے اخبار "نوائے وقت" کے مخصوص بنا دٹی حیاداری کے لب و لہجہ سے مجھے چڑ تھی۔ "نوائے وقت" میرا اخبار نہیں تھا۔ کوئی چھ برس ہوتے ہیں (میں ان دنوں ملتان میں تعینات تھا) کہ میں نے اس کا نام "فنون" میں ایک سفری مضمون "شوقِ آوارگی" کے تلے دیکھا۔ اس سفر نامے نے مجھے چونکا دیا۔ اس کی قدرتی شوخی، بیان کی سچائی اور دل بستگی، کھلنڈرے پن کے انداز نے میرا دل موہ لیا، عطاء الحق قاسمی جو کوئی بھی وہ تھا، لکھنا جانتا تھا۔ وہ ہے کون؟ اور اتنی مدت وہ کہاں چھپا رہا؟ مجھے یاد ہے کہ میں نے لاہور میں کسی کو لکھا کہ یہ عطاء الحق قاسمی کون ہے اور کیا کرتا ہے؟ مجھے اتنا ہی پتہ چل سکا کہ وہ لاہور کے ایک کالج میں لیکچرار ہے اور امریکہ ہو آیا ہے۔ ایک سال بعد لاہور کسی سرکاری کام پر آنے کا اتفاق ہوا تو عطاء سے پہلی بار ملا اور اب جب میں لاہور ہی میں ہوں ہماری ملاقاتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی صحبت مزے کی ہوتی ہے کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو تمہیں ہنستے ہنساتے ہیں اور کچھ عرصہ کے لیے تمہیں اپنی تاریک مایوسانہ سوچوں سے رہائی دلا دیتے ہیں وہ لوگ جن کے

بارے میں سٹیونسن نے کہا ہے کہ جب وہ ایک کمرے میں داخل ہوتے ہیں تو گویا ایک بتی اور روشن ہو جاتی ہے۔

مگر میں اس کی فکاہیہ نگاری سے لاہور آنے پر بھی بے تعلق رہا کیونکہ میں اس کا اخبار "نوائے وقت" نہیں پڑھتا تھا ویسے بھی میں اخباروں کے انتھک اور سنجیدہ پڑھنے والوں میں سے نہیں۔ عطا نے ایک آدھ بار مجھے اپنے کالم پڑھنے کی جانب رغبت دی مگر میرے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ اسے کچھ مایوسی ہوئی اور میں اس کا سایہ اس کے چہرے پر دیکھ سکتا تھا۔ دراصل مجھے کچھ ایسا خیال تھا کہ عطا جیسا سچا ادیب ایک اچھا فکاہیہ کالم نگار نہیں ہو سکتا ۔ فکاہیہ کالم ہوتا بھی کیا ہے زبردستی کی لطیفہ گوئی، سیاسی چوٹیں اِدھر اُدھر کی خفیف پھبتی بازی اور جگت کی لوٹ، اگر میں عطا کے فکاہیے نہیں پڑھ رہا تھا تو اس محرومی سے کچھ نہیں کھو رہا تھا۔ !

پھر مارچ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات ہوئے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن پر پہلے سے ترتیب شدہ فیک نتائج، سرکاری پریس کی شرمناک ہرزہ سرائی اور فتحیابی کے شادیانے۔ ہم میں سے بہت سے جو جاندار ذوالفقار علی بھٹو کو اب تک چاہتے اور اس کے بارے میں فریب نظری میں مبتلا تھے اس کھلم کھلا ڈھونگ پر برہم ہوئے بغیر نہ رہ سکے ہم میں سے ہر ایک نے اس طرح محسوس کیا جیسے اس کی ذاتی تذلیل کی گئی ہو اور ہمارا خون کھولنے لگا کیا ہم اتنے ہی بے ضمیر اور خودداری سے محروم تھے کہ ہر جاہ پرست، مہم باز، مذہب اور حب الوطنی کے نام پر اور اپنی شوکت و حشمت برقرار رکھنے کی خاطر ہم پر ستم ڈھاتا رہے آمر اپنے اصل رنگوں میں سامنے آگیا اور ہم ٹیلی وژن پر اس کی دو تین کرتب بازیوں کے بعد یہ جاننے لگے کہ وہ ایک تیسرے درجے کے دل و دماغ رکھنے والا بے اصول شخص ہے جسے خلعت و کلاہ سے ماسوا کوئی اور چیز عزیز نہیں۔ سانپ کی طرح فریبی اور قطعی ناقابلِ اعتبار ہم اس سے نفرت کرنے لگے۔ ایک دو لوگوں نے اپنے ٹی وی سیٹ کے سکرین پھوڑ دیئے۔

ہمارے قومی پریس نے حسبِ دستور حاکمِ وقت کے کلمے پڑھنے کی روایت قائم رکھی

میں جانتا ہوں کہ صحافیوں کے بھی بیوی بچے ہوتے ہیں اور فاقے سے مرنا اچھی چیز نہیں مگر کیا میراثیوں کی طرز کی اتنی مسلسل قصیدہ خوانی ملازمت کے تحفظ کے لیے ضروری تھی؟ ان دنوں تم اخباروں کو ان کی خبروں یا اداریوں یا رائیوں کے لیے نہیں پڑھ سکتے تھے اور پاکستان ٹائمز جیسے چند اخبار تو ناقابلِ برداشت پھیکڑے بن کر رہ گئے۔ بہت سے دوسروں کی طرح میں نے بھی اپنا اخبار بدل کر "نوائے وقت" پڑھنا شروع کیا "نوائے وقت" کم ازکم خبریں تو دیتا تھا اور اس کے اداریے بھی اپنے مخصوص اسلامی اجارہ داری کے مزاج کے باوجود جچے تلے اور متوازن ہوتے تھے تب ہی میں حیرت اور مسرت سے فکاہیہ نگار عطاء الحق سے اصل متعارف ہوا۔

اس نامور اخبار میں عطاء کے فکاہیئے جو "روزنِ دیوار سے" کے عنوان سے اس کی تصویر کے ساتھ چھپتے تھے، بہترین چیز ہوتے تھے اور بہت سے اخبار پڑھنے والے سب سے پہلے انہی کا ورق الٹتے تھے بعض دفعہ وہ فکاہیہ وہاں ہوتا تھا اور بعض دفعہ نہیں کیونکہ عطا روزانہ کچھ نہ کچھ گھسیٹنے والا کالم نگار نہیں۔ اکثر جب اس کا وار سیدھا پڑتا تھا وہ پُرامتیاز خوبی سے لکھتا۔ وہ بڑی سلیس اور صاف زبان لکھتا ہے۔ قدرتی شوخی اور بے تکلفی سے معمور، بذلہ سنجی اور ظرافت سے دمکتی ہوئی۔ اس دور کی سیاست اور معاشرت کے ناہموار پہلو اس کی نگاہوں سے نہ بچ پاتے اور وہ انہیں بڑی خوش ذوقی اور سلیقے سے مگر لگی لپٹی رکھے بغیر بے نقاب کرنے سے نہ چوکتا۔ اس نے جرأت اور دلیری سے ایسی ایسی باتیں کہہ ڈالیں جو دوسرا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا مگر ایسے انوکھے اور خوبصورت طریق سے کہ محتسب حرف نہ رکھ سکیں وہ کچھ کچھ ڈرتا تھا کہ کہیں اسے اپنی لیکچررشپ سے ہاتھ نہ دھونے پڑیں اور میرا خیال تھا کہ ذہنی طور پر وہ اس کے لیے تیار تھا۔ میں اس کی سفرنامہ نگاری کا مداح تو تھا ہی، اب ان کالموں میں اس کی ذہانت اور طباعی کا قائل بھی ہو گیا۔ وہ ایک حقیقی لکھنے والا تھا اس کا دل صحیح جگہ پر تھا اور میں ان انوکھے اجلے کالم لکھنے والے سے قلبی یگانگت محسوس کرنے لگا۔ ہم ایک ہی ہوا میں سانسیں لیتے تھے ایک ہی ڈگر پر سوچتے تھے! اس کے کم ہی کالم میری نظر سے گزرے جن کا رنگ پھیکا ہو۔ جن کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ محض تفننِ طبع یا تمسخر کے لیے لکھے گئے ہیں۔

اس کے ان کالموں کی دھوم ہوگئی اور پڑھے لکھے لوگ ان کا ذکر کرنے لگے۔ نوائے وقت کی اشاعت لاکھوں تک جا پہنچی تھی کیونکہ اس کا رویہ دونوں فریقوں کی متوازن خبریں دینے کا تھا جب کہ پریس ٹرسٹ کے اخبار محض آمر کی مدحت سرائی کی تُرولیاں اور نرسنگے پھونک رہے تھے۔ عطاء کا "روزنِ دیوار سے" وسعت سے پڑھا جانے لگا۔ شہرت اس کے دروازے تک آ پہنچی اور اس کا نام "نوائے وقت" کے ساتھ اس طرح مربوط ہوگیا جیسے اس کے ایڈیٹر مجید نظامی کا۔ اتنی شہرت کسی کا بھی سر پھیر دیتی اور اگر اس سے عطاء کا سر پھر گیا (میں حقیقتاً نہیں جانتا) تو میں اسے الزام نہیں دوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے ان پر شورش ایام میں آمر کو گرانے میں ایک باعزت لائقِ تعریف پارٹ ادا کیا جس پر کوئی بھی اخبار نویس فخر کر سکتا ہے میں نے ہی اسے یہ سمجھایا کہ اس کے بعض کالم اپنی وقتی موضوعیت کے باوجود اپنی ایک زندگی رکھتے ہیں اور انہیں ضائع نہیں ہونا چاہیئے اگر انہیں منتخب صورت میں کتابی شکل دے دی جائے تو وہ کئی پڑھنے والوں کو مسّرت دیتے رہیں گے۔ عطاء کو میری بات سے خوشی ہوئی اور اس نے کہا کہ یہی بات اس کے اپنے دل میں تھی۔

" مگر سر۔ میرے کالموں کا انتخاب آپ کو کرنا ہوگا اور آپ ہی اس کا دیباچہ یا تعارف لکھیں گے" اس نے مجھے نوٹس دیا۔

عطا مجھے ایک بزرگ سینئر ادیب کا رتبہ دیتے ہوئے ہمیشہ "سر" سے خطاب کرنے پر اصرار کرتا ہے میں اس کو نہیں ٹوکتا۔ اس کے "سر" سے میں اپنی نظروں میں کافی معزز اور پُر منزلت ہو جاتا ہوں۔ عطا طبعاً جلد باز اور بے صبرا ہے اور آج کے کام کو کل پر ٹالنے پر (جو میرا سنہری اصولِ حیات ہے) یقین نہیں رکھتا۔ اگلے دن ہی مجھے اس کے پچھلے تین سالوں میں لکھے ہوئے کوئی ڈیڑھ سو، دو سو فکاہیوں کے تراشے سونپ دیئے گئے اس ہدایت کے ساتھ کہ دو تین روز میں ان میں سے چالیس پچاس بہترین فکاہیوں کو چُن دوں جو فی الواقع کھلتے ہوئے مہکتے دمکتے ہوں اور جن سے ایک معقول ضخامت کی کتاب بن سکے۔

میں ایک نہایت سست الوجود شخص ہوں اور ان دنوں کسی قسم کی چیز لکھنے سے میری جان جاتی ہے مگر میرے سر پر ڈیماکلیز کی تلوار لٹک رہی تھی اور میں نے یہ کام مقررہ وقت پر کر لیا

اور سچ مچ یہ کوئی کام نہ تھا بلکہ ایک مسرت بخش مشغلہ۔ وہ تراشے جو میری نظر میں وقتیت سے آگے ادبی حیثیت رکھتے تھے ان کے حاشیے میں میں نے تین کراس لگا دیئے دوسروں میں اپنی پرکھ کے مطابق دو اور ایک کراس۔ کئی فکاہیئے میں نے کراس دیئے بغیر چھوڑ دیئے۔ یہ نہیں کہ ان میں خوبی نہ تھی بلکہ محض اس لیے کہ میں نے کتاب کی گنجائش کے مدِ نظر چالیس کے لگ بھگ بہترین فکاہیئے چننے تھے۔ میں نے یہ سب تراشے کراسوں سے مزین اور وہ جن پر کراس نہیں لگے تھے، عطا کے حوالے کئے جس نے وقت ضائع کئے بغیر اسی شام انہیں اپنے ایک مرید کاتب کے حوالے کر دیا (یہ کاتب میں اسے ملنا چاہوں گا کتابت کی اجرت کتاب چھپ جانے اور فروخت ہونے پر لیتا ہے) میں بھول گیا کہ میں نے کتاب کو ایک مبسوط سیر حاصل دیباچہ یا پیشِ لفظ بھی مہیا کرنا ہے اور ابھی اس کے متعلق فکر کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ کتابت دو تین دن میں تو ہونے سے رہی عطا مجھے مستقلاً درغلاتا رہا کہ کتابت کے مکمل ہونے کا انتظار کئے بغیر میں دیباچہ لکھ ڈالوں اس کا خیال تھا کہ کتابت کے مرحلے کے دوران ہی میرے چل بسنے کے امکانات روشن ہیں اور اس کی کتاب انتخاب کرنے والے کے دیباچے سے کوری رہ جائے گی۔

کتابت ہو چکی (اس میں تین چار مہینے لگ گئے کیونکہ کتاب کی اشاعت پر اجرت لینے والا کاتب اس دوران میں ناساز ہو گیا تھا) اور ایک اچھی صبح مجھے مطلع کیا گیا کہ کتاب چھپنے کے لیے تیار ہے اور اب دیر میرے دیباچے کی ہے میں نہیں سمجھتا کہ دیباچہ کتاب کے لیے کیوں ضروری ہے اور کتابیں دیباچوں کے بغیر کیوں نہیں چھپ سکتیں۔ میں نے دبے لہجے میں مصنف کو اپنے نظریئے سے آگاہ کیا۔ اس کا نظریہ مختلف تھا۔ دیباچہ مجھے لکھنا ہوگا۔ قول سے پھرنا مردوں کا شیوہ نہیں۔ میرے پاس اب کوئی عذر نہ تھا اور دیباچہ نگاری کی ابجد سے ناواقف ہونے کے باوجود میں قدرے اوٹ پٹانگ عرضِ حال لکھنے بیٹھ گیا جسے اب تم پڑھ رہے ہو (یعنی اگر تم واقعی اسے پڑھ رہے ہو)

ایک انتخاب لازمی طور پر نامکمل اور ذاتی ہوتا ہے اور اگر تمہیں اس میں اپنی پسند کا

کوئی فکاہیہ نہ نظر آئے تو اس میں قصور نہ مصنف کا ہے، نہ انتخاب کرنے والے کا۔ میں نے اس انتخاب کو گوناگوں اور رنگارنگ بنانے کی ایماندارانہ کوشش کی ہے تاکہ یہ مختلف مذاق کے پڑھنے والوں کو دلنشین ہو سکے۔ وہ جن کا مزاج سیاسی نہیں ہے۔ اور جو گزشتہ ملکی سیاست اور اس کے پیشواؤں سے پوری طرح بیزار ہو چکے ہیں سوشل اور فکری فکاہیوں میں اپنی مسرت ڈھونڈ سکتے ہیں۔ انتخاب اچھا ہے یا بُرا۔ یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک چمکدار بستر میں پڑھنے کی کتاب ہے جو بہت سوں کو خوشی دے گی۔

میں تمہیں اس کتاب کے بارے میں اور کیا بتا سکتا ہوں۔ یہ عرض حال یا دیباچہ۔ میں دیکھتا ہوں کافی طوالت پکڑ گیا ہے اور ہے بھی کچھ اول جلول۔ مجھے اس خیال میں عافیت نظر آتی ہے کہ بیشتر سمجھ دار پڑھنے والے عرض حال یا دیباچہ وغیرہ کے پڑھنے پر اصل کتاب کے پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں (اگرچہ میں ان لوگوں کو بھی کافی تعداد میں جانتا ہوں جن میں ایک میں بھی ہوں جو کتاب کے گردپوش کی تعریفی عبارت پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کے اندر جھانک کر نہیں دیکھتے) میں امید کرتا ہوں کہ کوئی اس عرض حال کو نہیں پڑھے گا اور ہوشمند قاری فوراً اس فرحت اور مسرت کی طرف پلٹیں گے جو آنے والے صفحات میں انکی منتظر ہے۔

محمد خالد اختر

۲۰ر دسمبر ۷۷ء

تصحیح: صفحہ ۲۴۱ پر شائع شدہ کالم کا عنوان "فرض کرو کہ" شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔ نوٹ فرمالیں۔

اپنی وفات پر ایک تعزیتی کالم

آہ! عطاء الحق قاسمی

منفرد سفر نامہ نگار، ممتاز کالم نویس اور ٹھیک مٹھاک شاعر عطاء الحق قاسمی کی موت سے ادبی حلقوں میں جو خلاء پیدا ہو گیا ہے وہ آسانی سے پُر ہو جائے گا۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی لوگ مرتے آئے ہیں اور ہماری آپ کی خواہشات کے برعکس دوسرے لوگ ان کی جگہ لیتے رہے ہیں۔ مرحوم بڑے ہنس مکھ اور زندہ دل واقع ہوئے تھے بات بات پر قہقہے لگاتے تھے اور پھر رات کو سوتے وقت ان قہقہوں کا جواز بھی تلاش کرتے تھے۔ ان کا تعلق ایک ممتاز علمی اور مذہبی گھرانے سے تھا۔ گھر میں انہیں ملحد اور بے دین سمجھا جاتا تھا جب کہ ملحد اور بے دین حلقوں میں ان کا شمار صلحاء میں ہوتا تھا۔ دراصل مرحوم کی شخصیت خاصی اُلجھی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کے ایک دوست گلزار وفا چودھری کا کہنا تھا کہ اس شخص کا دل مومن، دماغ چینی اور کرتوتیں امریکی ہیں۔ جب کہ مرحوم اس سلسلے میں خاموشی اختیار کرتے تھے جس کا مطلب نیم رضامندی سمجھا جاتا ہے۔ مرحوم کی طبیعت میں اضطراب بھی بہت تھا۔ ماحول کی یکسانیت سے اکتا جاتے تھے روزانہ کسی ایک شخص کا چہرا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کسی کے پاس آدھ گھنٹہ سے زیادہ بیٹھنا ان کے بس میں نہیں تھا اور دوسروں کے بس میں بھی نہیں تھا۔ صبح گھر سے دفتر جاتے وقت وہ روزانہ کوئی نیا راستہ اختیار کرنے کی کوشش فرماتے چنانچہ رستے کی اجنبیت کے باعث آئے دن کسی گڑھے سے برآمد ہوتے۔ ان کی تغیر پسندی کا یہ عالم تھا کہ ہر دو چار ماہ بعد ان کے دستخط تک تبدیل ہو جاتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے متلوّن مزاج ہونے کے باوجود مرحوم کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار تھی تاہم یہ ان کا اپنا بیان تھا جس کی تصدیق یا تردید نہیں ہو سکی۔ مرحوم بہت بے چین رہتے تھے اور سکون کے متلاشی

تھے۔ چنانچہ شادی سے قبل وہ اسی کی تلاش میں امریکہ اور یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے لیکن دو سال بعد اپنا اور دوسروں کا سکون غارت کر کے واپس لوٹ آئے۔ وطن عزیز سے انہیں بے پناہ محبت تھی اور اس معاملہ میں انتہا کے جذباتی تھے چنانچہ اپنی تمام تر خاندانی اور طبعی شرافت کے باوجود "پاکستانیت" کے مسئلہ پر دھینگا مُشتی سے بھی گریز نہیں فرماتے تھے انہیں تصنّع بناوٹ، مُنافقت اور نظریاتی دھوکہ بازی سے شدید نفرت تھی اور ایسے لوگوں کو دیکھ کر ناک پر رومال رکھ لیتے چنانچہ انہیں اکثر اسی حالت میں پایا گیا۔ مرحوم کو دوسروں کے بارے میں کڑوی سے کڑوی سچی بات ان کے منہ پر بیان کرنے کا بہت شوق تھا اور یوں بڑے حق گو تھے۔ تاہم اپنے بارے میں دوسروں کو ہمیشہ حسن ظن سے کام لینے کی تلقین کرتے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی ان کے بارے میں سچی بات کہہ دیتا تو گھنٹوں آزردہ رہتے کہ لوگوں میں کھرے اور کھوٹے کی پہچان نہیں رہی۔ مرحوم سکھوں کے مشہور شہر امرتسر میں پیدا ہوئے اس کا اندازہ ان کی بعض عادات سے بھی ہوتا تھا مثلاً" یہ کہ کسی انتہائی ناخوشگوار واقعہ سے دوچار ہونے کے باوجود ٹھنڈے ٹھنڈے گھر واپس آجاتے تھے لیکن کئی گھنٹے بعد اور بعض صورتوں میں کئی دنوں بعد اچانک انہیں خیال آتا تھا کہ اس روز تو ان کی سخت توہین ہوئی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ پیچ و تاب کھانا شروع کر دیتے تھے۔ ان کی محبت و نفرت بھی عجب قسم کی تھی کسی دوست کی غیر دوستانہ حرکت پر ان کی نفرت انتہائی شدید لیکن عارضی نوعیت کی ہوتی تھی۔ جب کہ ان کی محبت دھیمی دھیمی لیکن دائمی تھی۔ آخر عمر میں انہوں نے خلاف عادت اس فیلڈ میں شدت اور پائیداری کا بیک وقت مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں وہ ہر وقت دردناک اشعار پُرسوز لَے میں گاتے پائے گئے حتیٰ کہ اسی عالم میں وفات پائی۔

مرحوم کی تمام عمر ضابطوں اور پابندیوں میں گزری معاشرے کی پابندیاں، زبان کی پابندیاں اور قلم کی پابندیاں۔ انہوں نے ان پابندیوں کے خلاف کبھی صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ بلکہ ان کے عین مطابق اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔ حتیٰ کہ اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

حق مغفرت کرے عجب "آزاد" مرد تھا

۶ جنوری ۱۹۷۶ء

کسی اور بھائی کو کوئی اعتراض؟

صدرِ مملکت، ان کے مشیر اور وزیر روزِ اوّل سے آزادئ تحریر و تقریر کا پرچار کر رہے ہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ وہ لکھنے، بولنے اور سوچنے والوں کو اس پر اکساتے رہے کہ اگر انہیں موجودہ حکومت کی پالیسیوں پر کسی قسم کا کوئی اعتراض ہو تو وہ بلا جھجک اسے سامنے لائیں انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا بلکہ صدر مملکت نے تو غالباً اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا کہ وہ ملک میں ایسی جمہوریت بحال کرنا چاہتے ہیں کہ ایک آدمی کھڑا ہو کر انہیں بلا خوف کہہ دے "بھٹو تم جہنم میں جاؤ!" پہلے تو یار لوگ اس پر یقین نہ لائے کہ "خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا" والی بات تھی مگر جب یہ بات پورے تواتر سے کہی گئی تو انہوں نے دبے دبے لفظوں میں کچھ کہنا شروع کیا اور جب اس پر انہیں واقعی کچھ نہ کہا گیا تو وہ ہمہ وقت دل کی بھڑاس نکالنے پر تل گئے ان میں سے کچھ تو ایسے دیدہ دلیر واقع ہوئے کہ وہ روزِ اوّل سے حکومتِ وقت کی ناپسندیدہ سرگرمیوں کی نشاندہی میں مصروف ہو گئے، انہوں نے اس ضمن میں اقتدار سے "پروانہ" لینے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اور اب یہ خبر تو آپ نے پڑھ ہی لی ہو گی کہ "فوجی عدالت نے اردو ڈائجسٹ، زندگی اور پنجاب پنچ کے مدیروں اور ناشروں کے خلاف مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا۔ الطاف حسن اور مجیب شامی کو ایک ایک سال قید اور ایک ایک لاکھ روپیہ جرمانہ، حسین نقی اور مظفر قادر کو ایک ایک سال قید بامشقت اور دو دو لاکھ روپے جرمانہ کی سزا، ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کو دو مقدمات میں دو سال قید اور دو لاکھ روپے جرمانہ"

اگر آپ یہ خبر پڑھ کر رونے کے موڈ میں ہیں، تو بھی یہ لطیفہ سن لیجیے! ایک خانصاحب چوک میں مجمع لگائے اپنی دوائیوں کی تعریف میں رطب اللسان تھے ایک گھنٹہ کی مقفیٰ و مسجع اور مدلّل تقریر کے بعد انہوں نے حاضرین سے کہا ۔

" میری ان باتوں پر میرے کسی بھائی کو کوئی اعتراض ہو تو وہ بولے "۔

حاضرین میں سے ایک دبلے پتلے سے شریف النفس قسم کے انسان نے ہاتھ کھڑا کیا اور بولا ۔

" خاں صاحب! مجھے ایک اعتراض ہے "

خاں صاحب نے اسی پہلے جیسی روانی میں کہا: " تم بکواس بند کرو! اور کسی بھائی کو کوئی اعتراض ہو ۔؟"

تو یارو ! تین ایڈیٹروں کو فوجی عدالت نے سزائیں سنادی ہیں کسی اور بھائی کو کوئی اعتراض ہو۔؟"

۱۶ر اپریل ۱۹۷۲ء

ـــــــــ ناقابلِ انتقال

بسوں اور لاریوں کی ٹکٹوں پر جلی حروف میں " ناقابلِ انتقال" لکھا نظر آتا ہے۔ ہمیں اس دعوے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اربابِ اختیار سے اتنی گزارش ضرور ہے کہ وہ صرف ٹکٹوں کے سلسلے ہی میں "ناقابلِ انتقال" کی گارنٹی نہ دیں بلکہ اس فہرست میں بچارے مسافروں کو بھی شامل کر لیں جو سفر کے دوران " ناقابلِ انتقال" والی ٹکٹ جیب میں رکھنے کے باوجود آئے روز انتقال کر جاتے ہیں اور اس بہانے اگلے روز اپنی تصویریں اخباروں میں شائع کراتے ہیں۔

۸ر دسمبر ۱۹۷۵ء

براستہ بیڈن روڈ

ادھر ہمارے عرب بھائی خون میں انگلیاں ڈبو کر داستانِ حریت کا ایک نیا باب تحریر کر رہے ہیں اور ادھر ہمارے بیان باز لیڈروں کی بن آئی ہے۔ یہ ان جماعتوں کے لیڈر ہیں، جن کا وجود ایک عدد لیٹر پیڈ کا مرہونِ منت ہے اور جن کی جملہ سیاسی سرگرمیاں اخباری بیانات تک محدود ہوتی ہیں۔ یہ لوگ بیان دینے کے لئے ہر لحظہ کسی بحران کے منتظر رہتے ہیں۔ خود بخود پیدا ہو جائے تو زہے نصیب ورنہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ان کا بیان پہلے آجاتا ہے، بحران لیٹ ہو جاتا ہے، ویسے ماضی میں اکثر قومی بحران ان کے بیانات ہی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، جب سے عرب اسرائیل جنگ شروع ہوئی ہے ان کی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے (ہمارا بس چلے تو ان کا سر ہمیشہ کڑاہی میں رہنے دیں!) چنانچہ آئے روز کوئی نہ کوئی بیان داغتے ہی رہتے ہیں اور ہم لوگ بڑے اہتمام سے انہیں شائع بھی کرتے ہیں۔ ان دنوں سب سے آسان اور مجرّب نسخہ رضا کار بھیجنے کی پیش کش والا ہے۔ یہ وہ پیش کش ہے جس کی پذیرائی کی نوبت نہیں آتی، یوں ہنگ لگتی ہے نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا آتا ہے۔ واہ واہ بھی ہو جاتی ہے اور بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔ چند روز ادھر کی بات ہے ایک لیڈر نے اعلان کیا کہ اس کے دس ہزار سرفروش اپنے عرب بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ دوسرے نے اسے اپنے لئے ایک عظیم چیلنج تصور کرتے ہوئے، بیس ہزار رضا کاروں کو سینائی کے محاذ پر بھیجنے کا اعلان کر کے ان دونوں کا سیاسی مستقبل تاریک کر دیا اور یہ کل کی خبر ہے ایک رہنما نے دو لاکھ رضا کاروں کو اپنے اخباری بیان میں عرب بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑا کے ان سب کا منہ بند کر دیا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اب تک شائع ہونے والے

ان تمام کاغذی رضا کاروں کی اگر گنتی کریں تو پتہ چلے کہ پاکستان کی اصل آبادی کم ہے اور یہ رضا کار زیادہ ہیں۔
یہ عظیم پیش کش صرف موجودہ عرب اسرائیل جنگ ہی میں نہیں کی گئی بلکہ اس سے پہلے ۶۵ء اور ۷۱ء کی پاک بھارت جنگ اور ۶۷ء کی عرب اسرائیل کش مکش میں بھی یہ پیش کش دہرائی گئی مگر افسوس کبھی کسی نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا، فائدہ اٹھایا تو صرف ان پیش کش کرنے والوں نے جن کا بیان بمعہ تصویر اخباروں میں شائع ہوا اور یہ تاثر مستزاد کردہ عوام کے مقبول ترین رہنما ہیں اتنے مقبول کہ پچاس ساٹھ ہزار لوگ تو ان کے لئے ہر وقت جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں، ۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں تو اس نوع کے ایک رہنما کو جس نے ساٹھ ہزار رضا کاروں کی پیش کی تھی۔ بارہ چودہ افراد کے ایک جتھے کو ریلوے اسٹیشن سے چوبرجی کی طرف لے جاتے دیکھا بھی گیا کسی نے پوچھا "بھائیو کدھر جا رہے ہو"؟ رہنما نے ان کی طرف سے سینہ تان کر جواب دیا "مصر"، پوچھنے والے نے حیرت سے پوچھا "مصر"؟ رہنما نے چمک کر کہا "ہاں مصر"، راہگیر نے پریشانی کے عالم میں پوچھا "پیدل"، جواب ملا "ہاں پیدل"، تب راہگیر نے کچھ سوچ کر اطمینان سے سر ہلایا اور کہا تو بھائیو پھر بیڈن روڈ سے جاؤ، شارٹ کٹ ہے۔

اگر مصر کے جناب سادات اور شام کے حافظ الاسد سے ہماری بے تکلفی ہوتی تو ان کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگا کر یہ فرمائش ضرور کرتے کہ جناب یہ رضا کاروں والی پیش کش ازراہِ تفنن ہی سہی مگر ایک بار قبول ضرور فرمالیں تاکہ ان شارٹ کٹ رستے کے مسافروں سے ہماری جان چھوٹے۔ اگر ایسا ہو جائے تو عوام نے ان کے ساتھ کیا جانا ہے۔ البتہ وہ ان رہناؤں کو بارڈر تک چھوڑنے ضرور جائیں گے اور اس اقدام سے پاک عرب عوام کی دوستی پر یقیناً خوشگوار اثر پڑے گا اگر ایسا ممکن نہیں اور ہنگ پھٹکڑی لگے بغیر رنگ اتنا ہی چوکھا آتا ہے تو پھر پانچ لاکھ رضا کار ہمارے ایک اشارے پر بھی ہر وقت کٹ مرنے کے لئے تیار ہیں۔ صدر سادات و جناب حافظ الاسد نوٹ فرمالیں۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۷۳ء

شاہ مدار صاحب!

مہنگائی، مہنگائی کا شور سنتے تھے، مگر دل نہیں پسیجتا تھا کہ ایک بیوی ہے اور ایک اس کا یہ خادم، والدین کے مکان میں رہتے اور ان ہی کا دیا کھاتے تھے، کپڑے "امریکہ" کے چل رہے تھے، سو لوگ ہمارے پاس آنکلے، مہنگائی کا رونا روتے اور ہم دل میں ہنستے کہ اس قوم کو ہر وقت بڑبڑانے کی کچھ عادت سی پڑ گئی ہے۔ لے دے کے سکوٹر اپنے پیسوں سے خریدا تھا۔ جوں جوں یہ مہنگا ہوتا چلا گیا، ہمارے دل میں لڈو پھوٹتے رہے، کہ ری سیل ویلیو بڑھ رہی ہے، مگر جب سے کل کا اخبار پڑھا اور پٹرول کی قیمت میں زبردست اضافہ کی خبر سنی ہے گزشتہ تمام برسوں کی مہنگائی کا غصّہ ہمارے اندر جمع ہو گیا ہے، بالکل اس شخص کی طرح جو غصہ سے لال پیلا ہو کر اپنے دوست کے پاس پہنچا، اور کہا میں فلاں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، اس نے پوچھا کیا ہوا؟ کہنے لگا کہ اس نے گزشتہ سال مجھے بن مانس کہا تھا، دوست نے حیرت سے پوچھا، مگر غصہ آج کیوں آرہا ہے! کہنے لگا کہ بن مانس میں نے آج ہی دیکھا ہے! ہم نے بھی مہنگائی کا بن مانس آج ہی دیکھا ہے، سو غصہ سے بھرے ہوئے ہیں، غصہ صرف یہ نہیں کہ پٹرول مہنگا ہوا ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ کل کو اس کے سبب دوسری چیزیں بھی مہنگی ہوں گی، ہمیں پھر ایک آدمی یاد آگیا ہے، جسے زمیندار نے صبح بلایا اور شام تک بیگار لیتا رہا، رات کو وہ شخص گھر پہنچا تو دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا، دلاسا دینے والے نے کہا کہ مصیبت کا وقت گزر گیا اب کیوں آنسو بہا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ زمیندار نے کل پھر بلایا ہے۔

کل کیا ہوگا، اس کا ذکر آج ہی کے اخباروں میں آگیا ہے، مثلاً یہ کہ رکشہ ٹیکسی والوں نے ہڑتال

کر دی ہے اور اعلان کیا ہے کہ جب تک پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ کے بعد کرایوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک وہ ہڑتال جاری رکھیں گے مطالبات یہ ہیں کہ رکشہ کا کرایہ ستر پیسے فی میل اور ٹیکسی کا کرایہ ایک روپیہ فی میل مقرر کیا جائے رات کے ساڑھے دس بجے کے بعد ڈرائیور کو ڈیڑھ گنا کرایہ طلب کرنے کی اجازت دی جائے انتظار کے ضمن میں تین روپے فی گھنٹہ مقرر کیا جائے ادھر حکام نے ریلوے کے کرائے بڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہے ٹرانسپورٹروں نے بھی عام کرایوں اور باربرداری کے کرایوں میں اضافے کا فیصلہ کیا ہے اور آخر میں ان سب فیصلوں کے نتیجے میں ان تمام اشیائے ضرورت کی قیمتیں خود بخود بڑھ جائیں گی جو ایک شہر سے دوسرے شہر کو بھیجی جاتی ہیں بلکہ کرایہ میں اگر چار آنے اضافہ ہوگا تو تاجران اشیائے کی قیمتیں روپوں کے حساب سے بڑھائیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے کروڈ آئل کی قیمت میں سترہ فیصد اضافہ سے پٹرول کے نرخ میں صرف ۱۳ پیسے فی گیلن کا اضافہ ہونا چاہیئے تھا مگر حکومت نے ایک روپیہ پچیس پیسے فی گیلن کے حساب سے اضافہ کر دیا ہے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا کہ مہنگائی پر ہمارا دل محض اس لئے بھر آیا ہے کہ ہم "صاحب سکوٹر" ہیں، سو اس وقت سے ہمیں مظلوم محنت کش عوام کے تمام دُکھ درد یاد آرہے ہیں اور یہ ایک فطری امر ہے کیونکہ مگرمچھ ایسی مخلوق بھی بعض مواقع پر آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتی ہے بلکہ اس وقت ہم جذبات کی اس سطح کو چھو رہے ہیں کہ ہم اپنے عظیم محسن ڈاکٹر مبشر حسن کے اس احسان کو بھی بھلا دینا چاہتے ہیں جو انہوں نے تنخواہوں میں ۳۵ روپے کی خطیر رقم کے اضافہ کے اعلان کی صورت میں فرمایا تھا بعض لوگ رو رہے ہیں مگر یہ لطیفہ سن لیجئے کہ کسی شہر میں جب مسلسل کئی روز تک زلزلے آنے لگے تو ایک شخص نے اپنے ایک لاڈلے مگر انتہائی شریر بچے کو کسی دوسرے شہر اپنے ایک عزیز کے پاس بھیج دیا۔ دو دنوں بعد اس عزیز کا تار موصول ہوا کہ جناب اپنا بچہ واپس لے جائیے اور زلزلے یہاں بھیج دیجئے " سو ہمارا بھی جی چاہ رہا ہے کہ مبلغ ۳۵ روپے نصف جس کے ساڑھے سترہ روپے ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحب کے نام منی آرڈر کر دیں اور درخواست کریں کہ حضور! یہ وصول فرمایئے اور سستا زمانہ واپس بھیج دیجئے!

پٹرول کے نرخوں میں اضافہ پر ایک اور "صاحب سکوٹر" بھی آبدیدہ تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ مہنگائی پہلے ہی کچھ کم نہ تھی اب اس میں مزید اضافہ ہو گیا ہے اس موقع پر انہوں نے "مرے کو مارے شاہ مدار" والی بات بھی کہی ہم نے کہا مرے ہوئے تو عوام ہیں مارنے والی مہنگائی ہے مگر یہ شاہ مدار کون بزرگ ہیں؟ کہنے

لگے یہ سرمایہ داری نظام ہے جو انسان کو حریص اور سنگدل بنا دیتا ہے ملک میں جتنی مہنگائی بڑھ رہی ہے جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ فحاشی اور عریانی کو فروغ حاصل ہے اخلاقی قدریں ختم ہو رہی ہیں، تن بیچے جاتے ہیں من بیچے جاتے ہیں، قتل ہوتے ہیں، رشوت چلتی ہے اور وہ سب کچھ جو ہو رہا ہے انہی شاہ صاحب کی بدولت ہے ہم نے پوچھا عوامی حکومت نے شاہ صاحب کو اتنی کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے؟ کہنے لگے اللہ کو یہی منظور تھا یہ سُن کر ہم چُپ ہو گئے۔

اللہ ہمیں قوتِ گویائی دے

۲۴ر نومبر ۱۹۷۳ء

ـــــــــ بے نیازی

بانو بازار میں انگوٹھیاں، جوتیاں اور چاٹ سبھی کچھ ملتا ہے۔ لیکن گزشتہ روز ہم نے یہاں اونٹ فروخت ہوتے بھی دیکھا ہے اور حیرت سے آنکھیں مل رہیں یہ بات ہم بطور لطیفہ نہیں کہہ رہے بلکہ درحقیقت بانو بازار کے نکڑ پر سائیکل سٹینڈ کے قریب یہ عجیب الخلقت مخلوق رنگ برنگی ریشمی چادروں میں لپٹی کھڑی تھی اور اس کے قریب کھدر کے میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ساربان تھا اردگرد سے گزرنے والی خواتین بڑے اشتیاق سے اونٹ کو دیکھتی تھیں اور وہ ان سب سے بے نیاز بیزاری کے عالم میں تھوتھنی آسمان کی طرف اٹھائے کھڑا تھا اگر اونٹ کی عمر طویل ہوتی ہے تو جان لیں کہ اس کی طوالتِ عمر کی وجہ خواتین سے بھی بے نیازی ہے!

۱۱ر دسمبر ۱۹۷۵ء

خلیفہ جی سے!

لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی کانفرنس نے لوگوں کے دلوں کو گرما دیا ہے۔ اس کے بارے میں پرجوش رویہ تو لاہور والوں کا بھی ہے مگر جو لاہور سے باہر ہیں ان کی بے چینی اور جوش و خروش دیدنی ہے۔ مضافات والے غالباً یہ سمجھ رہے ہیں کہ لاہور والے چونکہ میزبان ہیں اس لئے معزز مہمانوں کے ساتھ آج کل ان کی گاڑھی چھنتی ہوگی۔ شاہراہ قائداعظم پر سے گزرتے ہوئے دن میں دو چار بار آمنا سامنا ہوتا ہوگا۔ اور ایک دوسرے سے حال احوال دریافت کیا جاتا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تاثر ایسا ہے کہ اسے قائم ہی رہنا چاہیئے۔ چنانچہ ایک موضع سے ہمارے ایک عزیز نے خط لکھا تو ہم نے ان کی متذکرہ نوع کی خوش فہمیوں کی تصدیق کی بلکہ انہیں بتایا کہ کل سرراہے شام کے صدر جناب حافظ الاسد سے ملاقات ہوئی' تو وہ بڑی گرمجوشی سے ملے اور عرب اسرائیل تنازعہ پر خاصی دیر ان سے گفت گو ہوتی رہی۔ ہم انہیں یہ بتانے سے رہے کہ شاہراہ قائداعظم پر آتے ہی میزبانوں کا سامنا معزز مہمانوں سے نہیں بلکہ معزز پولیس سے ہوتا ہے اور وہ انکا "حال احوال" دریافت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں زیادہ پرلطف صورت حال ایک دور دراز دیہات کے نامہ نگار کے خط سے ہوئی جنہوں نے ایک چیف ایڈیٹر سے گزارش کی ہے کہ وہ اسلامی کانفرنس میں ان کی نشست مخصوص کرادیں۔ انہوں نے ایک گذارش یہ بھی کی ہے کہ اگر ممکن ہو تو کچھ فالتو دعوتی کارڈ ان کے دوستوں کے لئے بھی رکھ لیں۔ کیونکہ وہ بھی اس کانفرنس میں شرکت کے بہت خواہش مند ہیں! خدا کرے چیف ایڈیٹر نے انہیں صحیح صورت حال سے آگاہ نہ کیا ہو کہ اس میں ہم میزبانوں کی عزت ہے۔

اس ضمن میں اخبارات میں ایک مراسلہ لاہور کے ڈاکٹر ناموس کا بھی شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر ناموس سے ہمارا تعارف ایک کتاب کے واسطے سے ہے جس میں انہوں نے آدھے صفحہ پر اپنی ڈگریوں کی تفصیل درج کی ہے اور آدھے صفحے پر ان مناصب کا ذکر کیا ہے جن پر وہ فائز رہے ہیں۔ اس سے اگلے صفحے پر انہوں نے ان مقامات کا نام لکھا ہے جنکی سیاحت کا انہیں موقع ملا ہے اور اس میں بطور خاص میاں چنوں کے نواح کا ذکر ہے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب نے حکومت کو تجویز پیش کی ہے کہ مسلمان سربراہان مملکت کے ذہنوں پر بہتر تاثر چھوڑنے کیلئے ضروری ہے کہ انہیں اپنے علمی اور تہذیبی ورثہ سے روشناس کرایا جائے۔ آگے چل کر انہوں نے یہ فراخدلانہ پیش کش کی ہے کہ وہ ان سربراہانِ مملکت کے سامنے "کرۂ ارض پر اسلامی فتوحات" کے موضوع پر بزبانِ انگریزی ایک گھنٹہ لیکچر دینے کے لیے تیار ہیں۔ اگر حکومت بھی تیار ہے تو فوراً ان سے رابطہ قائم کرے! ہم ڈاکٹر صاحب کے اس جذبے کی قدر کرتے ہیں اور انہیں یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ یہ کام ففٹی پرسینٹ ہوا سمجھیں کیونکہ وہ اس کے لیے راضی ہیں۔ بس حکومت کا راضی ہونا باقی رہ گیا ہے۔ رہے سربراہانِ مملکت، سو وہ جب دو صفحات پر پھیلی ہوئی ڈاکٹر صاحب کی ڈگریاں، مناصب کی تفصیل اور مقاماتِ سیاحت خصوصاً میاں چنوں کا ذکر پڑھیں گے تو ہماری طرح ان پر بھی دبدبہ طاری ہو جائے گا اور ان کے دل میں ڈاکٹر صاحب کی کم از کم ایک جھلک دیکھنے کی خواہش ضرور پیدا ہوگی!

کانفرنس کے ضمن میں جوش و خروش کی کچھ مثالیں بعض تجاویز کے ذریعے بھی منظر عام پر آرہی ہیں سربراہانِ مملکت کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے ملکوں کے نام سے پہلے خلافت کا لفظ لکھیں اور خود خلیفہ کہلائیں۔ جیسے خلیفہ سادات اور خلیفہ عدی امین وغیرہ! ظاہر ہے یہ تجویز بہت عمدہ ہے اور صرف اس کے پڑھنے سے ہی ہمارے اندر ولولۂ ایمانی پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم ان سطور کے ذریعے "خلیفہ ذوالفقار علی بھٹو" سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کانفرنس کے ایجنڈا میں یہ مسئلہ سرِفہرست رکھ دیں۔

۲۰ر فروری ۷۴ء

ایٹمی دھماکہ اور خربوزے

مئی کا مہینہ گذر گیا مگر اس بار اسماعیل میرٹھی کسی کو یاد آتے تھے نہ آئے۔ حتّٰی کہ انتظار حسین کو بھی جو سال بہ سال اپنے کالم میں ؎

مئی کا آن پہنچا ہے مہینہ بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ

کے حوالے سے انہیں یاد کر لیتے تھے۔ بلکہ ہر سال مئی کے حوالے سے اسماعیل میرٹھی کا تذکرہ پڑھ کر ہمیں تو یہ گمان گذرنے لگا تھا کہ شاید ان کی پیدائش اس مہینے میں ہوئی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایف اے کے ایک طالب علم کے حافظہ میں یہ بات رہ گئی کہ مولانا حالی پانی پت کے "میدان" میں پیدا ہوئے تھے۔ مئی کے مہینے میں اس بار اسماعیل میرٹھی کی یاد کسی کو یوں نہ ستائی کہ اب کے چوٹی سے ایڑی تک پسینہ نہیں بہا۔ بلکہ اب جون کا وسط ہے اور یہ وہ مہینہ ہے جب انسانوں کی جون بدل جاتی ہے۔ اور وہ سڑکوں پر گھوڑوں کی طرح گز بھر کی زبانیں لٹکائے پھرتے نظر آتے ہیں مگر عالم یہ ہے کہ پرسوں رات بارش کے دوران گھر روانہ ہوئے، تو ہم نے بغلوں میں ہاتھ دیئے ہوئے تھے اور یہ سطور لکھنے تک چھینکیں روکنے میں مشغول ہیں۔ سنا ہے یہ خوشگوار موسمی تغیر ہمارے عزیز دوست بھارت کی دین ہے جس نے حال ہی میں پائیدار امن کی خاطر ایٹمی دھماکہ کیا ہے ہمارے حکمرانوں کو اس خیر سگالی کا جواب خیر سگالی ہی کی صورت میں دینا چاہیئے۔ اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہم بھی انہی دنوں میں ایٹمی دھماکہ کر ڈالیں۔ تاکہ بھارتی حکمرانوں کو ہماری طرف سے ٹھنڈی ہوا وں کا سندیسہ موصول ہو۔ نیز قیامِ امن کے ضمن میں ہم پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس ہلّے میں ان سے بھی عہدہ برآ ہو جائیں۔

ایٹم بم کے تذکرے سے خربوزوں کی طرف آتے ہوئے کچھ حجاب سا تو محسوس ہوتا ہے۔ مگر

ایک تو یہ خربوزوں کا موسم ہے اور دوسرے یہی خربوزے اگر درختوں پر لگے ہوں تو جھکڑ کے دوران ان کے نیچے سے گذرنے والا کوئی شخص شاید اس انداز میں نہ سوچے سو بطرز ابن انشا "بارے" کچھ بیان خربوزوں کا ہو جائے کہ یہ خادمِ عوام پھل ہے۔ اسے زمین سے نکالا جاتا ہے۔ زمین پر فروخت کیا جاتا ہے اور پھر اس کے چھلکے بھی زمین ہی پر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان پر سے پھسلنے والا بھی واپس زمین ہی پر آتا ہے (شنید ہے کہ زمین سے اس گہرے رشتے کے باوجود ڈاکٹر وزیر آغا کریہ پھل مرعوب نہیں واللہ اعلم بالصواب) موسم کے اوائل میں یہ پھل بہت میٹھا آتا تھا۔ اب جو دو چار بارشیں ہوئیں ہیں تو اس کی مٹھاس دکاندار کی شیریں بیانی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ بات ہم نے یوں کہی ہے کہ گذشتہ روز اس میوہ کی خرید کے لئے زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھے ہوئے ایک عوام سے ہم نے ان کے میٹھا ہونے کی بابت دریافت کیا تو اس نے انہیں "کھوپہ" قرار دیتے ہوئے کہا۔

"باؤ جی! اتنے میٹھے ہیں کہ بس انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے!"

اس پر ہم نے اس کے کان میں کہا:۔

"بات یہ ہے کہ بیس سیر خربوزے ایک ٹونے ٹوٹکے کے سلسلے میں درکار ہیں۔ عامل نے ایک شرط یہ بھی بتائی ہے کہ یہ پھیکے ہونے چاہئیں۔!"

اس پر اس نے جوابی سرگوشی کرتے ہوئے کہا:۔

"باؤ جی! چاہے سارے ہی لے جاؤ۔ ایک بھی میٹھا نکل آئے تو پیسے واپس لے جانا!"

۱۳ر جون ۷۸ء

ـــــــــــ سفید پوش

"سفید پوش" وہ ہے جو باسی برکتے کے تندور سے کھانا کھا کر نکلے اور ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے باہر خلال کرتا پایا جائے۔

۲۰ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

محترم چور صاحب !

کل رات ہمارا قریباً نیا لمبریٹا سکوٹر (LEJ ۵۱۰۲) واپڈا ہاؤس کے باہر سے چوری ہو گیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی بس اتنی سمجھیں کہ تھوڑی دیر کے لئے ہم واپڈا ہاؤس میں واقع ایک ریستوران میں گئے اور جب واپس آئے تو سکوٹر اپنی جگہ پر بلکہ کسی بھی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ جب تک یہ ہماری ملکیت میں تھا ہم اس سے اور وہ ہم سے بہت نالاں تھا ہم یوں نالاں تھے کہ نیا ہونے کے باوجود اس کی حرکات بہت پرانی تھیں عین اس جگہ پہنچ کر آگے بڑھنے سے انکار کر دیتا تھا۔ جہاں کوسوں دور تک کسی مستری وغیرہ کا نام ونشان نہیں ملتا تھا اور وہ ہم سے یوں نالاں تھا کہ صبح اس کی پشت پر سوار ہوتے تھے اور رات کو دس گیارہ بجے کے قریب اترنے کا نام لیتے تھے تاہم اس کے "اغوا" کے بعد سے ہماری کیفیت کچھ بدلی بدلی سی ہے سکوٹر بیچارا کیونکہ بے زبان ہے۔ اس لئے اس کے جذبات کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے تاہم جہاں تک ہمارے اپنے جذبات کا تعلق ہے ہم احمد فراز کی زبان میں صرف یہی کہہ سکتے ہیں ؎

رنجش ہی سہی دِل دُکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کیلئے آ

یہ سانحہ ہمارے لئے کچھ یوں بھی زیادہ اندوہناک ہے کہ اب اس کا نعم البدل ملنے کی بھی کوئی توقع نہیں گو ایک صاحب نے تو اپنے ایک دوست سے اس کے والد کے انتقال پر ان الفاظ میں تعزیت کی تھی کہ خدا تمہیں اس کا نعم البدل عطا فرمائے مگر جیسا کہ ہم نے ابھی عرض کیا۔ نعم البدل تو دور کی بات ہے ہمیں اپنے سکوٹر کے چوری ہونے پر اس COMPENSATION کی توقع بھی کم کم نظر

آتی ہے جو گذشتہ برس شہزاد احمد کو اس کا سکوٹر چوری ہونے کی صورت میں ملی تھی یعنی مالی طور پر اس نقصان کی تلافی آدم جی پرائز والوں نے ان کے شعری مجموعہ پر پانچ ہزار روپے انعام دے کر کر ڈالی۔ رہے ہم، سو اقبال کے پیروکار ہیں اور یوں گذشتہ رات سے مسلسل "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" گنگنانے میں مشغول ہیں۔

سکوٹر کے "اغوا" کی رپٹ تو ہم نے گذشتہ شب ہی سول لائنز میں درج کرادی تھی۔ چونکہ پولیس کے بارے میں ہمارا یہ حسن ظن تاحال قائم ہے کہ مجرم ان کی نگاہوں سے چھپے نہیں ہوتے چنانچہ وہ "مغویہ" کو برآمد کرنے میں دیر سے کام نہیں لیں گے اور اسی طرح محترم چور صاحب کے بارے میں بھی ہم یہی حسن ظن رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے ضروری کاموں کے سلسلے میں دو چار دن کے لئے سکوٹر کی ضرورت تھی اور سوئے اتفاق ہے کہ ان کی نظر انتخاب ہمارے سکوٹر پر پڑی ورنہ ان کی نیت خراب نہیں تھی اگر ہمارا یہ خیال درست ہے تو چور صاحب کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ اپنے ضروری کاموں سے فراغت کے بعد ہمارا سکوٹر وہیں چھوڑ جائیں جہاں سے وہ لے کر گئے تھے اور اگر وہ ہماری ہی طرح سفید پوش ہیں اور یہ سکوٹر بیچ کر اپنی اس سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنا چاہتے ہیں تو پھر ایک گذارش یہ ہے کہ وہ سکوٹر کی فروخت سے حاصل شدہ پانچ چھ ہزار روپے کی رقم میں سے صرف دو ہزار روپے کا ڈرافٹ ہمارے نام ارسال کر دیں۔ کیونکہ ہم گذشتہ ایک برس سے اپنے سکوٹر کی قسطیں اتار رہے تھے اور اب ہمارے ذمے صرف دو ہزار روپے کی رقم باقی رہ گئی تھی۔ اگر چور بھائی یہ سکوٹر فروخت نہیں کرنا چاہتے کہ انہیں ذاتی استعمال کے لئے ہم سے زیادہ اس کی ضرورت ہے تو پھر کسی دن دفتر لوائے وقت آ کر ہم سے سکوٹر کی چابیاں بھی لے جائیں۔ جو اب ہمارے پاس یونہی بے کار پڑی ہیں کیوں کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے اس سفید پوش بھائی کو نئی چابیاں بنانے کے لئے کچھ رقم خرچ کرنی پڑے۔ اگر اس ضمن میں انہیں ہماری نیت پر کچھ شک ہے تو کسی روز ۶۱۶۷۷ پر ٹیلیفون کے ذریعے کسی ایسی سنسان جگہ کا پتہ بتا دیں جہاں ہم چابیوں کا چھلا چھوڑ آئیں۔ کیونکہ یہ "چھلا" اب ہمارے لئے اس محبوب کی نشانی بن کر رہ گیا ہے جو بچھڑ گیا ہو۔ اور یہ نشانی بھی اب ہم اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے

۹ جولائی ۷۶ء

تاہم چور صاحب کا شکریہ

آج ہمارے سکوٹر کی واپسی کا "سوئم" ہے، یعنی واپس ملے ہوئے تیسرا روز ہے اور اس کے لئے یہ جو سوئم کا لفظ ہم نے استعمال کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی خستہ حالی و درماندگی کے باعث لگتا ہے جیسے وفات پا چکا ہو۔ ہم گزشتہ تین روز سے اس کے "علاج معالجے" میں مصروف ہیں کیونکہ اس کے معالجِ خصوصی یعنی ہمارے مکینک کا کہنا ہے کہ گو سکوٹر میں ظاہری طور پر ساری علامات "انتقالِ پُر ملال" کی ہیں مگر درحقیقت یہ "سکتے" کے عالم میں ہے اور یوں اسے باقاعدہ زندوں میں شامل کرنے کے لیے خاصا وقت اور روپیہ مصرف میں لانا پڑے گا۔ تاہم ہمارے ذمے چور صاحب کا شکریہ واجب ہے کیونکہ سکوٹر کی واپسی ہمارے لئے "ٹارزن کی واپسی" سے کم نہیں۔ یہ مسئلہ بہرحال اپنی جگہ قائم ہے کہ ہمیں یہ سکوٹر کس صورت میں ملا لیکن ہم صدقِ دل سے مکرم و محترم چور صاحب بالقابہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ہم پر کرم فرمائی کی، تاہم یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ آئندہ وہ ایسی کرم فرمائی کی نوبت ہی نہیں آنے دیں گے۔

چونکہ یہ دور ایسا ہے کہ لوگ چوروں سے بھی منصفی چاہتے ہیں، اس لئے متذکرہ شکریئے کے بعد ایک معاملے میں ہم بھی اپنے چور صاحب سے منصفی چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ سکوٹر کی واپسی کا فیصلہ انہوں نے امروز میں جناب احمد ندیم قاسمی (عنقا) مشرق میں جناب انتظار حسین، مساوات میں جناب سہیل ظفر، جمہور میں جناب صفدر سعید اور اخبارِ جہاں میں اسرار زیدی کے شائع شدہ کالموں میں سے کس کا کالم پڑھ کر کیا ہے۔ ان میں سے جمہور والے کالم کے بارے میں ہمارا خیال ہے

کہ چور صاحب نے اس سے متاثر ہو کر کرم فرمائی بہرحال نہیں کی، کیونکہ یہ دور ایسا ہے کہ کسی بھی قسم کے چور "جمہور" کو خاطر میں نہیں لاتے البتہ اس امر کا امکان موجود ہے کہ انہوں نے یہ فیصلہ پیپلز پارٹی کے ترجمان "مساوات" میں سہیل ظفر کا کالم پڑھ کر کیا ہو اور ہمارے ساتھ پُرخلوص اظہارِ ہمدردی کو وہ "پارٹی" کا حکم سمجھ بیٹھے ہوں تاہم اس ضمن میں ہم خود کوئی فیصلہ صادر نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی کسی ذاتی رائے کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ چور صاحب اسے کسی قسم کی جانبداری پر محمول نہ کرلیں۔ ہم تو صرف چور صاحب سے منصفی کے طلب گار ہیں اور ہماری یہ خواہش روایتِ زمانہ کے عین مطابق ہے۔

چور صاحب سے منصفی چاہنے کی ضرورت ہمیں منو بھائی کا کالم پڑھ کر بھی محسوس ہوئی ہے جو اس ضمن میں سب سے آخر میں چھپا ہے اور جس میں انہوں نے کہا ہے کہ چور کو صرف حضرتِ عنقا کے کالم کا انتظار تھا، کیونکہ اس سے اگلے ہی روز ہمیں سکوٹر واپس مل گیا۔ اس کے ساتھ دوسری باتوں کے علاوہ انہوں نے اپنے کالم میں اس شگفتہ شبہے کا اظہار بھی کیا ہے کہ سکوٹر دراصل چوری ہوا ہی نہیں تھا بلکہ ہم نے پبلسٹی حاصل کرنے کی خاطر یہ سکوٹر کچھ روز کے لئے اپنے کسی دوست کے گھر میں چھپا دیا تھا اس پر ہمیں وہ نوجوان یاد آ گیا جسے اس کے والد نے کسی ایسے کام کے لئے بھیجا، جس کے لئے دو منٹ سے زیادہ کا عرصہ درکار نہیں تھا مگر جب وہ گھنٹے دو گھنٹے بعد لوٹا تو والد کی ڈانٹ ڈپٹ کے جواب میں اس نے تاخیر کی وجہ یہ بتائی کہ دراصل اس کے ایک دوست کا دس کا نوٹ گم ہو گیا تھا۔ اس پر والد نے کہا کہ اوّل تو نوٹ تمہارے دوست کا گم ہوا تھا۔ دوسرے تم اتنا عرصہ آخر کیا کرتے رہے؟ اس نے جواب دیا کہ "وہ اتنا عرصہ نوٹ پر پاؤں رکھے کھڑا تھا"۔ یہ لطیفہ ہمیں یوں یاد آیا کہ منو بھائی ہمارے دوست ہیں، سو اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ ہمارے سکوٹر کے ضمن میں ان کا کالم اگر تاخیر سے آیا، تو بہرحال کچھ "باعثِ تاخیر" بھی تھا، لہٰذا متذکرہ معاملے میں منصفی بھی اب ہم انہی سے چاہتے ہیں۔ چور صاحب اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھیں!

اس چوری پر پردہ ڈالنے کے لئے سکوٹر کا نمبر پلیٹ بدلنے والے پینٹر، پرزوں اور وضع قطع میں ادل بدل کرنے والے مکینک اور ہمارے دوست منو بھائی نے اپنے کالم کے ذریعے جو رول ادا کیا اس سے قطع نظر گمشدگی سے بازیابی تک کے مرحلے میں ہمیں ملک کے مختلف حصوں سے بلامبالغہ سینکڑوں کی تعداد میں "تعزیت" اور پھر مبارک بادی کے خطوط موصول ہوئے ہیں جن کے لئے

ہم ان سب حضرات کے شکر گزار ہیں تاہم اس کے ساتھ ساتھ فرمائشوں کا ایک سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے، چونکہ سکوٹر کی گمشدگی پر خود ہم نے بھی اپنے کالم میں چور صاحب سے دردمندانہ درخواست کی تھی کہ وہ براہِ کرم اسے واپس چھوڑ جائیں، اس لئے ہمارے وہ دوست جو چوروں کے زخم خوردہ ہیں، ان دنوں دھڑا دھڑ ہم سے رجوع کر رہے ہیں، چنانچہ شہزادا احمد اور مستنصر حسین تارڑ نے اپنے اپنے سکوٹر کی تیسری "برسی" کے موقع پر ہمیں چور صاحب سے مسیحائی کے لئے کہا ہے۔ رضا مہدی بھی اپنے سکوٹر کی بازیابی چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال سرہندی اپنی اس محدّب شیشے والی بیٹری کی واپسی کے لئے ہماری سفارش چاہتے ہیں جو گزشتہ دنوں ان کے مطب سے کوئی "مریض" اٹھا کر لے گیا تھا اسی طرح ہمارے ایک دوست اپنی بائیسکل اور ایک دوسرے دوست اپنی بائیسکل کے اس والونٹ کی واپسی کے خواہش مند ہیں جو گزشتہ دنوں کسی نے کمال دلیری سے کام لیتے ہوئے اتار لیا۔ ظاہر ہے ہم اپنے دوستوں کے اس کرب میں برابر کے شریک ہیں مگر اس ضمن میں جو کر سکتے ہیں وہ صرف دعا ہی ہے۔ چنانچہ اختتام میں ان کی تشفی کے لئے اختر شیرانی کے الفاظ میں اس نیک خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ

ساری دنیا کے مریضوں کو شفا ہو یارب
اب یہ معلوم ہوا ہے کہ علالت کیا ہے!

ظاہر ہے "علالت" سے "صحت یابی" تک کے مراحل سے تازہ تازہ ایک ہم ہی آشنا ہوئے ہیں اور یوں جب ساری دنیا کے "مریضوں" کی "شفایابی" کے لئے دعا مانگتے ہیں تو جان لیجئے کہ صدقِ دل سے مانگتے ہیں!

۱۸ جولائی ۷۴ء

ایک ہفتہ ہماری فرمائش پر بھی !

ہمارے ہاں کی ریت یہ ہے کہ اگر کوئی قومی شخصیت انتقال کر جائے تو سال کے سال اس کا یومِ ولادت مناتے ہیں اور جو قومی خصوصیت دم توڑ چکی ہو، اس کی یاد کے لئے پورا ہفتہ وقف کرتے ہیں، چنانچہ ہفتہ شجرکاری کا آغاز ہو چکا ہے۔ اب ہفتۂ صفائی اور ہفتۂ خوش اخلاقی وغیرہ کی باری ہے۔ ہفتہ صفائی منانے کی ضرورت کارپوریشن کو محسوس ہوتی ہے چنانچہ اس کا عملہ پورا ہفتہ صفائی کی "برسی" اس کے شایانِ شان منانے کا اہتمام کرتا ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ گزشتہ برس جب کارپوریشن کو اس بھولے ہوئے فرض کی یاد ستائی اور یوں اس نے ہفتہ صفائی کا آغاز کیا، تو صبح ہی صبح خاکروں کے جھنڈ کے جھنڈ کوچوں کی صفائی کے لئے پہنچ گئے۔ ہم تو پھر انسان ہیں، محلے کے بے جان و بے زبان در و دیوار تک حیرت سے ان اجنبیوں کو تک رہے تھے، جن کی شکل انہوں نے اس سے قبل نہیں دیکھی تھی۔ خود ہم جب اپنی خوشگوار حیرت پر قابو نہ پا سکے تو ایک خاکروب سے پوچھ ہی لیا کہ :۔

"جناب! آپ تنخواہ کے رجسٹروں میں تو ہمیشہ نظر آتے تھے مگر آج یہاں بنفسِ نفیس آنے کی زحمت کیسے گوارہ فرمائی؟"

ہماری اس جسارت پر اس نے ناک بھوں چڑھائی اور کہا :۔

"ہم تو جی، روز ہی یہاں ہوتے ہیں، آپ کی نظر کمزور ہو تو اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔"

ظاہر ہے اس جواب پر ہم خاصے خفیف ہوئے اور ندامت مٹانے کے لئے عرض کی کہ :۔

"اگر آج مدتوں بعد آپ نے ہمارے علاقے میں قدم رنجہ فرما کر یہ عزت بخش ہی دی ہے تو اب تلخ کلامی سے اس پر پانی تو نہ پھیریں۔ آخر خوش اخلاقی بھی کوئی چیز ہے!"

اس پر اس نے جھاڑو ایک طرف رکھا اور کمر پہ ہاتھ دھر کر بولا :۔

"بابو: ہم ہفتہ صفائی منا رہے ہیں، ہفتہ خوش اخلاقی نہیں، ان سات دنوں میں صفائی کے بارے میں کوئی شکایت ہو، تو بات کرنا.... !"

اور اب ہفتۂ خوش اخلاقی کی بھی سن لیں۔ ایک بار اس ہفتے کے دوران ہم اومنی بس میں سوار ہوئے تو کنڈکٹر سینے پر "ہفتۂ خوش اخلاقی" کا بیج سجائے اور چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ سے اس کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے ہمارے پاس آیا اور انتہائی خوش اخلاقی سے پوچھنے لگا :۔

"جناب: آپ کہاں تشریف لے جائیں گے"؟

ہم نے عرض کیا "ماڈل ٹاؤن"

اس پر اس نے قدرے جھک کر کہا "براہِ کرم اٹھائیس پیسے عنایت فرمایئے"۔ ہم نے اٹھائیس پیسے اس کی ہتھیلی پہ رکھے اور ساتھ ہی ٹکٹ کے لئے ہاتھ پھیلا دیا۔ اس نے ہمارا "دست سوال" دراز دیکھا تو مسکرا کر کہنے لگا :۔

"چھوڑیئے حضور: ٹکٹ لے کر آپ کیا کریں گے؟"

ہم نے کہا "بسیں خریدیں گے!"

یہ جواب سن کر وہ بہت نفاست سے ہنستے ہوئے بولا :۔

"آپ بہت بذلہ سنج معلوم ہوتے ہیں!"

ہم نے عرض کی "یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے، آپ براہِ کرم ٹکٹ عنایت کریں۔ آخر ایمانداری بھی کوئی چیز ہے۔"

اس پر اس نے ایک نظر ہم پر ڈالی اور یہ کہہ کر آگے کو چل دیا کہ:

"یہ ہفتہ خوش اخلاقی" ہے، ہفتہ ایمانداری نہیں ـــــ فی الحال آپ ہماری خوش اخلاقی ملاحظہ فرمائیں"۔

سو اس روز سے آج تک ہم "ہفتہ ایمانداری" ہی کے منتظر ہیں۔ جس دن رہنماؤں نے سنجیدگی

سے قوم کو ایماندار بنانے کا فیصلہ کر لیا، اس کے بعد ایک ہفتے کی شجر کاری، ایک ہفتے کی خوش اخلاقی اور ایک ہفتے کی صفائی کے ذریعے سال بھر کی غفلت پر پردہ ڈالنے کی ضرورت نہیں رہے گی مگر شرط یہ ہے کہ یہ "ہفتۂ" ایمانداری سالوں پر محیط ہونا چاہیئے۔ یہاں "سالوں" سے ہماری مراد "برسوں" سے ہے اور اگر سالوں سے مراد "جورو کے بھائی" ہی لیے جائیں تو بھی یہ فقرہ اپنی جگہ پر مکمل ہے کیونکہ گزشتہ برسوں میں ملک میں جتنی کرپشن بڑھی ہے، اس میں ان "سالوں" کا بھی خاصا ہاتھ ہے۔

۱۲ر اگست ۱۹۷۷ء

ش سے شاعر

گذشتہ کرفیو کے دنوں میں ایک شہر میں حالات خاصے سنگین تھے کرفیو کے اوقات میں ایک شاعر کے دروازے پر دستک ہوئی جس پر اس نے گھبرا کر بلکہ ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو سامنے ایک شاعر دوست کو کھڑا پایا۔ اس نے بغل میں بیاض دابی ہوئی تھی، دروازہ کھولنے والے نے کرفیو کے اوقات میں اپنے اس دوست کو سامنے پایا، جس کا گھر بھی دوسرے محلے میں تھا اور جس کے پاس کرفیو پاس بھی نہ تھا تو وہ بہت حیران ہوا، اسی حیرانی کے عالم میں اس نے اپنے اس شاعر دوست سے آمد کا مقصد دریافت کرنا چاہا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتا، شاعر دوست نے کہا "ملک صاحب کے ہاں مشاعرے میں نہیں چلنا؟" اس پر اس نے اپنی ہنسی ضبط کی اور پوچھا "کیسے چلیں گے، کرفیو لگا ہوا ہے۔" "کوئی ایسی بات نہیں" شاعر دوست نے جواب دیا "گلیوں میں سے نکل چلتے ہیں!"

۲۰ر اگست ۱۹۷۷ء

مری بار کیوں دیر اتنی کری ؟

پاکستان رائٹرز گلڈ کے ریجنل سیکرٹری نے گلڈ کے ارکان کے نام ایک چھٹی ارسال کی ہے' جس کا مضمون حسب ذیل ہے۔

مکرمی ! سلام ممنون

وزیرِ اعلیٰ پنجاب کے پریس سیکرٹری کی طرف سے ہمیں ایک چٹھی موصول ہوئی ہے جس میں لکھا ہوا ہے کہ حکومت رائٹرز گلڈ کو کاروں کے دس بارہ پرمٹ دے سکتی ہے۔ اگر آپ کو اپنے ذاتی استعمال کے لیے کار مطلوب ہو تو براہِ کرم اپنی درخواست ۳۰ ستمبر ۱۹۷۴ء تک رائٹرز گلڈ کے دفتر میں پہنچادیں۔ موصول شدہ تمام درخواستیں وزیرِ اعلیٰ کی خدمت میں پیش کر دی جائیں گی اور صاحب موصوف پرمٹوں کے اجرا کا فیصلہ صادر کریں گے۔ آپ مناسب سمجھیں تو ممبر رائٹرز گلڈ کے حوالے سے براہِ راست بھی (پریس سیکرٹری صاحب وزیرِ اعلیٰ پنجاب) حکومت سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر رشید انور سیکرٹری

یہ خط ہمارے لیے کئی وجوہ کی بنا پر باعثِ دل چسپی ہے سو ہم نے اسے کئی بار مزے لے لے کر پڑھا ہے۔ ایک چیز جسے ہم نے دل ہی دل میں بہت سراہا ہے، وہ اس خط کی آخری سطر ہے، جس میں بڑی فراخدلی سے ادیبوں کو یہ حق دے دیا گیا ہے کہ "وہ حکومت سے براہِ راست رابطہ بھی قائم کر سکتے ہیں"۔ ورنہ آج تک بعض ادیبوں کا حکومت سے رابطہ مختلف اداروں کی وساطت ہی سے

تھا۔ اس خط میں دوسرا قابلِ قدر پہلو ہمیں یہ نظر آیا ہے کہ اس سے قبل پرمٹ وغیرہ کی ترغیبات سیاستدانوں کی طرف سے سیاستدانوں ہی کے لیے ہوتی تھیں، مگر اب اس کا دائرہ ادیبوں تک وسیع کر دیا گیا ہے اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ جناب حنیف رامے خود ادیب ہیں اور ایک ادیب ہی اپنے ادیب بھائیوں کے مفادات کی اس دھڑلے سے نگہبانی کر سکتا تھا۔

متذکرہ خط کے ان روشن پہلوؤں کے باوجود کچھ دوستوں کو اس میں مایوسیوں کے پہلو بھی دکھائی دیئے ہیں۔ مثلاً ایک بے گھر ادیب کو یہ تار موصول ہوا تو اس نے جانا کہ یہ رائٹرز کالونی کے ضمن میں ہے، جس کے رُکن خود حنیف رامے بھی ہیں۔ انہوں نے غالباً ادیبوں کی اس دیرینہ پریشانی کو رفع کرنے کا سہرا اپنے سر باندھنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یوں یہ خط اس سلسلے کی کڑی ہے مگر جب اس نے چٹھی کا مضمون پڑھا تو سر تھام کر بیٹھ گیا کہ وہ تو نانِ جویں کو بھی ترستا ہے۔ اس "لیک" کے لیے مطلوبہ رقم کہاں سے لائے گا؟ اسی طرح چٹھی میں مذکور دس بارہ کاروں کے پرمٹوں کے اجراء کے ضمن میں ملک میں دس بارہ متمول ادیبوں میں سے ایک کے ساتھ گفتگو ہوئی تو انہوں نے بھی خاصی مایوسی کا اظہار کیا۔ ان صاحب کا کہنا تھا کہ ادیبوں کیلئے ان پرمٹوں کی باری بڑی دیر سے آئی ہے۔ ہم نے جواب میں "دیر آید درست آید" والا مقولہ دہرایا تو بھی وہ قائل نظر نہ آئے ان کی دلیل یہ تھی کہ شروع شروع میں اس نوع کے ایک پرمٹ پر پچیس تیس ہزار روپے کی بچت ہو جاتی تھی، مگر بے شمار "ضرورت مندوں" کو یہ پرمٹ جاری کرنیکے باعث اب صورتِ حال یہ ہے کہ ایک پرمٹ پر دو چار ہزار روپے سے زائد منافع نہیں ہوتا اور اس قدر کم داموں پر کیا خریدا جائے اور کیا بیچا جائے۔

ہم نے جواب میں کہا کہ کاروں کی قیمتوں کے اس اتار چڑھاؤ سے آپ، واقعی زیادہ باخبر ہیں، سو ہم اس سلسلے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اگر مارکیٹ میں کاروں کی بہتات کی وجہ سے انکی سیل ویلیو کم ہو گئی ہے تو بازارِ ادب میں سوداگروں کی روز افزوں تعداد کے باعث ادیبوں کی اپنی مارکیٹ ویلیو بھی اتنی ہی رہ گئی ہے جتنی "ڈیمانڈ اینڈ سپلائی" کے کلیے کی رو سے ہونی چاہیئے تھی، سو دینے والوں نے اگر بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر دیا ہے، تو اس پر رنجیدہ نہیں ہونا چاہیئے۔

متذکرہ خط کے مطالعہ کے بعد ایک اور صاحب نے جو نکتہ نکالا، وہ چند نانیوں کے لیے خاصا چونکا دینے والا تھا۔ انہوں نے کہا "حکومت کی یہ پیشکش ادیبوں کے لیے ہے ہی نہیں۔" خدا جانے

ہمیں ان کی اس بات سے کیوں خوشی سی محسوس ہوئی۔ سو ہم نے جھٹ سے پوچھا کہ "وہ کیسے" کہنے لگے "اس لیے کہ کاروں کی یہ پیش کش رائٹرز گلڈ کے لیے ہے۔" ہم اس جواب پر مایوس ہوئے اور کہا کہ "اللہ کے بندے آخر رائٹرز گلڈ بھی تو ادیبوں ہی کی ایک انجمن ہے۔" بولے "اس کے ارکان کی فہرست اٹھا کر دیکھ لو، پتہ چل جائے گا، ان میں آڑھتی کتنے ہیں اور ادیبوں کی تعداد کیا ہے؟
ہم نے فوراً یہ فہرست منگوائی اور ایک نظر ڈالنے کے بعد ان صاحب کو بتایا کہ "اس فہرست میں اکبری منڈی کے کچھ آڑھتی یقیناً شامل ہیں تاہم اکثریت ادیبوں ہی کی ہے"! کہنے لگے۔ "اب ان ادیبوں میں سے آڑھتی تلاش کرو" ہم نے یہ تلاش شروع کی تو شوکت صدیقی اور جمیل الدین عالی وغیرہ کے نام نظر آئے۔ کہنے لگے۔ "یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا، جو آڑھتی گلڈ میں سرگرم نظر نہیں آتے وہ حلقہ ہائے اربابِ ذوق اور پنجابی ادبی سنگت وغیرہ میں سرگرم عمل ہیں، کیونکہ اُدھر کمپٹیشن (COMPETITION) زیادہ ہو گیا تھا اور اِدھر ان کی مونوپلی (MONOPLY) ہے"
ہم نے آخر میں سٹپٹا کر پوچھا کہ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں"؟ دل جلا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولے "یہی کہ سچے ادیب گو رائٹرز گلڈ میں بھی ہیں مگر بہت کم ہیں اور پورے ملک میں بھی ان کی تعداد بس انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے پیشتر اس کے کہ بردہ فروش ان کا بھی سودا کر ڈالیں، ہمیں ابھی کچھ حفاظتی تدابیر اختیار کرنا چاہئیں۔" ہم نے سوال کیا "وہ کیسے؟" کہنے لگے "ایک ایسا پلیٹ فارم تیار کرنا چاہیئے۔ جہاں سچے ادیب جمع ہوں اور وہ حق کی آواز اٹھائیں"۔ یہ سن کر ہم نے غور سے ان کی طرف دیکھا اور محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ "عزیزی! آج کل نظریات کی منڈی میں باطل کی بھی مانگ ہے اور اچھے دام کلمۂ حق کے بھی مل جاتے ہیں، سو آؤ بہتر بدی کی طرف رجوع کریں"

۲۹ ستمبر ۷۴ء

گلشن کا کاروبار

فیض صاحب نے " چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے" والی دردمندانہ اپیل میں اتنا کچھ کہہ دیا ہے کہ ہر کوئی اسے اپنے معانی پہنانے میں مشغول نظر آتا ہے۔ مثلاً حلقہ اربابِ ذوق سیاسی والوں کا خیال ہے کہ اس کے سیدھے سادے معنی یہی ہیں کہ "برادرم انقلاب صاحب، آپ واپس گھر لوٹ آئیں، آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔" جب کہ حلقۂ اربابِ ذوق ادبی والے، ادب میں غیر ادبی حوالوں کے قائل نہ ہونے کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ اس شعر میں "گلشن" کوئی سیاسی استعارہ نہیں بلکہ یہ ایک نصیبوں جلی دوشیزہ کا نام ہے جس کا محبوب اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے چنانچہ فیض صاحب محض انسانی ہمدردی کے تحت اسے اپیل کرتے ہیں کہ وہ واپس چلا آئے تاکہ گلشن کا "کاروبارِ حیات" چل سکے۔ اسی طرح یہ شعر اگرچہ اُردو میں ہے تاہم پنجابی ادبی سنگت والے اپنی جگہ اس کے مطالب پر مطمئن ہیں کیونکہ ان کے خیال میں "چلے بھی آؤ" والی اپیل تارا سنگھ کی "فیملی" کے ان افراد سے ہے جو لاہور میں رہتے ہوئے بھی ابھی تک اپنے بھائی بندوں سے رابطہ قائم نہیں کر سکے۔ چنانچہ فیض صاحب نے ان سے اپیل کی ہے کہ وہ سنگت کے اجلاسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوا کریں۔

ان تشریحات کے علاوہ ایک تشریح ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا کی بھی ہے جو بڑے "پھڈے باز" نقاد ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ فیض صاحب نے اس شعر میں مختلف "قومیتوں" کے افراد سے اپیل کی ہے کہ وہ چار علیحدہ علیحدہ جھنڈوں تلے جمع ہو جائیں اور اپنی علیحدہ ثقافت، علیحدہ زبان، علیحدہ موزخ، علیحدہ یہ علیحدہ وہ کے لئے پورے زور و شور سے آواز اٹھائیں اور جب یہ تحریک یار لوگوں کی "چشم پوشی"

سے قوت پکڑے تو اس کے رہنما براہِ کرم فیض صاحب کو فوراً مطلع فرمائیں تاکہ وہ برزنیف کو " REACH IMMEDIATELY " یعنی " چلے بھی آؤ " کا تار ارسال کردیں۔

فیض صاحب کے اس مصرعہ کی دیگر بے شمار تشریحات مختلف حلقوں کی جانب سے ہو رہی ہیں، جس کی وجہ سے ہم ان کے پہلے سے زیادہ قائل ہو گئے ہیں۔ یہ انہی کا کمال ہے کہ ان کے کلام کی تشریح ہر پہلو سے کی جاسکتی ہے چنانچہ ہم نے مشاعروں میں دیکھا ہے کہ ان کے شعروں پر مظلوم بھی پھڑک پھڑک جاتے ہیں اور داد دے دے کر ظالموں کا گلا بھی بیٹھ جاتا ہے۔ ہم اس پوزیشن میں تو نہیں ہیں کہ ان تشریحات میں کچھ مزید اپنی طرف سے اضافہ کرسکیں تاہم ہمارا جی چاہتا ہے کہ مولانا ماہر القادری کی تقلید میں اس مصرعہ کی " اصلاح " کے ضمن میں کچھ مشورہ دے ڈالیں۔ مثلاً ہم اگر فیض صاحب کی جگہ ہوتے تو " چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے " کی جگہ " چلے بھی جاؤ " کے الفاظ استعمال کرتے، جس سے اس شعر کے حسن کو چار چاند لگ جاتے لیکن غالباً ہمارا یہ مشورہ درست نہیں کیونکہ اس سے شعر کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اس سے تو یوں لگتا ہے جیسے نفرت کے بیوپاریوں سے کہا جا رہا ہو کہ وہ یہ ملک چھوڑ جائیں، سامراج کے ایجنٹوں کو دیس نکالا دینے کی بات کی جا رہی ہو، ظالموں اور غاصبوں کو کہا جا رہا ہو کہ وہ اس مقدس دھرتی سے نکل جائیں اور نتیجہ یہ نکالا جا رہا ہو کہ ان ناپاک لوگوں کے قلع قمع سے ہی گلوں میں رنگ بھر سکتا ہے اور بادِ نوبہار چل سکتی ہے۔ ہم یہ مشورہ واپس لیتے ہیں کیونکہ کسی شعر میں لفظی تبدیلی تو کی جاسکتی ہے۔ اس کا مفہوم تبدیل کرنے کا حق کسی کو نہیں دیا جاسکتا لہٰذا ہم آئندہ بھی " چلے بھی آؤ " والے مصرعے کو اسی طرح پڑھیں گے تاکہ اس کے مفہوم " BREZNEV REACH IMMEDIATELY " میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔

۱۷ / مئی ۷۵ء

لاٹھیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اپوزیشن کا "الف" گرا دیا جائے تو باقی "پوزیشن" رہ جاتی ہے اور پوزیشن تین طرح کی ہوتی ہے۔ پوزیشن جو اچھی بھی ہوتی ہے۔ بُری بھی ہوتی ہے اور پوزیشن جو لی بھی جاتی ہے۔ سو اپوزیشن میں اس وقت تینوں قسم کی پوزیشن کے لوگ موجود ہیں۔ اچھی پوزیشن میں حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی اور ان کے "ہم نوا" ہیں۔ اگر آپ انہیں باقاعدہ اپوزیشن میں شامل نہیں سمجھتے تو یوں کہہ لیں کہ حضرت مولانا صاحب "حکومت کی منظور شدہ" اپوزیشن کے رہنما ہیں اور اسے اقتدار کی زبان میں نہ صرف یہ کہ "صحت مند اپوزیشن" کہا جاتا ہے بلکہ صاحبان اقتدار ہر دور میں اس کی ضرورت پر بھی زور دیتے آئے ہیں۔ بری پوزیشن والی اپوزیشن میں متحدہ جمہوری محاذ والے شامل ہیں اور ان کی قسمت میں روزِ ازل سے لاٹھیاں کھانا (اور اپنے دورِ اقتدار میں لاٹھیاں برسانا بھی) لکھا ہے یہ لوگ بری پوزیشن والی کیٹگری میں اس لئے بھی آتے ہیں۔ کہ آمروں کے خلاف ان کی چلائی ہوئی تحریکوں کے نتائج دیکھ کر "دُکھ سہے بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں" والی بات یاد آجاتی ہے۔ تیسری قسم کی اپوزیشن میں اچھی یا بُری پوزیشن رکھنے سے قطع نظر وہ لوگ آتے ہیں۔ جنہوں نے حکومت کے خلاف باقاعدہ "پوزیشن" لی ہوئی ہے اور ہر دم چاندماری میں مصروف نظر آتے ہیں "پوزیشن لینے والی" یہ اپوزیشن تحریکِ استقلال ہے جس میں "تحریک" کی جھلکیاں کم اور "استقلال" کے پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔ ان "پوزیشنوں" والی اپوزیشن کے علاوہ ایک قسم اور بھی ہے۔ جن کے ارکان ان دونوں اپوزیشن کی فہرست میں تو نہیں آتے۔ البتہ ان کا شمار بہت "پوزیشن والے" لوگوں میں ہوتا ہے۔ ہمارا اشارہ خان عبدالقیوم خاں (مردِ آہن ریٹائرڈ) سردار شوکت حیات خاں (شوکتِ پنجاب ریٹائرڈ) اور جناب ممتاز محمد خاں دولتانہ کی طرف ہے اپوزیشن

کے حوالے سے ان کے متعلق "گوداں نہیں یہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں" والی بات تو نہیں کہی جا سکتی البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت رہی ہے اور یہ نسبت دور کی بھی نہیں بلکہ خاصی قریب کی تھی۔ یہ لوگ ہر حال میں قانع رہتے ہیں۔ چنانچہ اپوزیشن میں تھے تو خوش تھے۔ آج کل اقتدار میں ہیں تو بھی خوش ہیں ہماری دعا ہے یہ جہاں بھی رہیں، خوش رہیں۔

ان تمام "پوزیشنوں" میں متحدہ جمہوری محاذ اور تحریکِ استقلال کے مابین ان دنوں راہ و رسم بڑھتی نظر آتی ہے اور کبھی گھٹتی نظر آتی ہے۔ متحدہ جمہوری محاذ والے چاہتے ہیں کہ تحریکِ استقلال کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیں۔ تحریکِ استقلال کے اصغر خاں بھی اس طرف مائل نظر آتے ہیں۔ مگر وہ متحدہ محاذ کے رہنماؤں کی "جمہوری" حرکتوں سے خاصے الرجک ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ محاذ کے رہنما ایف ایس ایف سے لاٹھیاں کھا کے بھی بے مزہ نہیں ہوتے اور ہر بار گفتگو کی میز پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں وزیرِ اعظم بھٹو، کچھ اس انداز سے ان کا "حال احوال" پوچھتے ہیں کہ انہیں جواب میں "شکر الحمد للہ" کہنا پڑ جاتا ہے۔

کچھ اس ادا سے آپ نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

مگر جب کچھ وقت گذرتا ہے تو سر کے بال نوچ نوچ کر کہتے ہیں "اوئے ساڈے نال اے کی ہتھ ہو گیا؟" تاہم اس کے بعد پھر جب کبھی مذاکرات کا موقع آتا ہے۔ یہ بزرگ جمہوری روایات نبھانے کے لئے پھر گفتگو کی میز پر نظر آتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا مؤقف یہ ہے کہ وہ حکومت کی مخالفت تو کر سکتے ہیں مگر کسی چیز کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر وہ پاکستان کو نقصان پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لے سکتے۔ چنانچہ جب کبھی ملک کو کسی قومی یا بین الاقوامی بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وزیرِ اعظم بھٹو انہیں یاد فرماتے ہیں۔ اگر یہ بزرگ اس موقع پر حیل و حجت سے کام لیں تو وزیرِ اعظم بیرونی دنیا میں پاکستان کی حرمت کا واسطہ دیتے ہوئے احمد فراز کا یہ شعر ایک چٹ پر لکھ کر انہیں ارسال کر دیتے ہیں۔

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو ہم سے خفا ہے تو زمانے کے لئے آ

یہ شعر پڑھ کر جمہوری محاذ کے رہنماؤں پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور وہ ایک بار پھر "کوچہ رقیب" کی طرف سر کے بل چل پڑتے ہیں۔

ان بزرگوں کے برعکس اپنے اصغر خاں ہیں جنہوں نے حکومت کے خلاف پوزیشن لی ہوئی ہے اور ہر دم چاند ماری میں مشغول رہتے ہیں۔ یا اگر استعارے کی زبان میں بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اصغر خاں وہ شاعر ہیں جو کہیں بھی اپنا "کلام" سنانے سے باز نہیں آتے ایسے مواقع پر فیڈرل سکیورٹی فورس والے انہیں "ہوٹ" بھی کرتے ہیں۔ مگر وہ اس "بیداد" کو بھی "داد" تصور کرتے ہوئے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ بلکہ ان کے متعلق تو مشہور ہے کہ ایک بار وہ لاہور پلیٹ فارم پر اپنا کلام سنانے میں مشغول تھے اور سامعین میں پولیس اور ایف۔ ایس ایف کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی کہ اتنے میں انہیں گرفتار کر لیا گیا اور کسی نامعلوم جگہ پر جا کر چھوڑ دیا گیا وہ مین چار روز بعد مارا ماری کرتے لاہور پلیٹ فارم پر آئے اور ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر کہنے لگے تو حضرات میں عرض کر رہا تھا...." تاہم اس کے باوجود اصغر خاں وزیر اعظم بھٹو کی طرف سے دی گئی "بیت بازی" کی دعوت میں شریک ہونے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ بلکہ متحدہ محاذ والوں کو بھی ایسے مقابلوں میں شرکت سے روکتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں انہیں خدشہ ہو کہ وہ بھی محاذ کے رہنماؤں کی طرح "بیت بازی" کے ان مقابلوں میں جناب بھٹو سے "شکست" کھا جائیں گے اور پھر کچھ وقت گذرنے کے بعد بال نوچ نوچ کر یہ کہتے نظر آئیں گے" اوئے امیرے نال اے کی ہتھ ہو گیا؟" اگر ایسا ہے تو اصغر خاں جمہوری محاذ والوں سے زیادہ زیرک ہیں۔ کیونکہ جمہوری محاذ والوں کو جب "دعوتِ سخن" ملتی ہے تو وہ یہ سوچ کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں کہ "پھر بلایا ہے" مگر پھر تھکے ماندے مسافروں کی طرح پرائم منسٹر ہاؤس کا رخ بھی کر لیتے ہیں۔

۱۹ رمئی ۱۹۷۵ء

کیپ لیفٹ

ان دنوں اگر کوئی "لیفٹ" کی بات کرے تو اس پر پولیس کا اہلکار ہونے کا گمان گذرتا ہے، کیونکہ اب صرف پولیس والے "کیپ لیفٹ" (KEEP LEFT) کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں

۳۰ دسمبر ۱۹۷۷ء

"الحمدللہ" سے "ایکسکیوزمی" تک

ایک وقت تھا کہ بھری محفل میں اگر کسی کو چھینک آجاتی ، تو وہ اس شان سے چھینکتا تھا کہ در و دیوار ہل جاتے تھے اور اردگرد بیٹھی پبلک پر اس کی دھاک بیٹھ جاتی تھی نہ صرف یہ کہ وہ بلا خوف و خطر چھینکتا تھا بلکہ ایسے موقع پر وہ "الحمدللہ" کہہ کر خدا کا شکر بھی ادا کرتا تھا۔ اس کے جواب میں "حاضرینِ جلسہ" یرحمکم اللہ کہتے تھے۔ یعنی اسے دعا دیتے تھے کہ خدا تم پر رحم کرے یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ اس کے جواب میں چھینکنے والا حاضرینِ مجلس کے لئے جوابی دعائیہ کلمے "یہدیکم اللہ و یصلح بالکم" ادا کرتا تھا۔ یعنی اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارے حالات درست کرے مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ ان دنوں کیفیت یہ ہے کہ محفل میں اگر کسی کو چھینک محسوس ہو وہ کچھ اس طرح خفیف ہوتا ہے گویا اس نے الاسٹک والا پاجامہ پہنا ہوا اور یوں "اندیشہ ہائے دور دراز" میں مبتلا ہو چنانچہ اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہونے پر وہ چھینک کو روکنے کی کوشش میں مشغول ہو جاتا ہے مگر جب یہ چھینک آکر رہتی ہے تو یہ پشیمان شخص ، "الحمدللہ" کہنے کی بجائے ندامت بھرے انداز میں "ایکسیوزمی" کہتا ہے حاضرینِ مجلس بھی "یرحمکم اللہ" کے دعائیہ کلمے کی بجائے اسے گھور کر دیکھتے ہیں اگرچہ اس گھورنے کا مفہوم یہی پوشیدہ ہوتا ہے کہ "خدا تمہاری حالت پر رحم کرے" ، چھینک مارنے والے اور اس پر ردِعمل کا اظہار کرنے والے حاضرینِ جلسہ کے رویوں میں متذکرہ تبدیلی کی ممکنہ وجہ یہ ہے کہ لوگ ماڈرن ہو گئے ہیں اور یوں بھری محفل میں چھینک مارنے کو "ایٹی کیٹس" کے خلاف سمجھنے لگے ہیں۔ اسی طرح اس موقع پر چھینک مارنے والے کی طرف سے خدا کا شکر ادا نہ کرنا ، حاضرین کا جواب میں دعائیہ کلموں سے گریز کرنا اور "چھینک مار" کی طرف سے

ایک بار پھر "جواب آں غزل" پیش نہ کرنے کی وجہ ہماری سمجھ میں یہ آئی ہے کہ یار لوگوں کے پاس اب ایک دوسرے کے لئے دعائیں نہیں رہیں یا یہ کہ اس کے لئے وقت نہیں رہا۔ :

تاہم اس سارے معاملے کو ہمارے ایک دوست نے بالکل مختلف رنگ میں دیکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ چھینک مارنا کوئی معصومانہ فعل نہیں بلکہ یہ خاصی شر انگیز حرکت ہے اس سے ساکت فضاؤں کا جمود ٹوٹتا ہے۔ اور یوں دیکھا جائے تو اس کی حیثیت ایک نعرۂ مستانہ کی ہو جاتی ہے۔ نیز اس "چھینک" کا اثر صرف چھینکنے والے تک محدود نہیں رہتا بلکہ متعدی "مرض" ہونے کے باعث اس کے اثرات دور دور تک پہنچتے ہیں اور یوں ہر طرف سے "حق ہو" کی صدائیں آنے لگتی ہیں جس سے امن عامہ کی صورتحال خاصی خراب ہو سکتی ہے چنانچہ زمانے کے تیور دیکھ کر یا یوں کہہ لیں کہ ہوا کا رُخ جان کر لائحہ عمل مرتب کرنیوالے لوگ اس "چھینک" سے گریز کرنے لگے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے موقع پر نہ صرف یہ کہ چھینک مارنے والے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے بلکہ انہوں نے مِل جُل کر ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے کہ اُلٹا چھینک مارنے والا شرمندہ ہو کر رہ جاتا ہے چنانچہ ایسے موقع پر وہ "الحمد للہ" کہنے کی بجائے "ایکسیوزمی" کہہ کر اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ہمیں اپنے اس دوست کی بات میں خاصا وزن محسوس ہوا ہے چنانچہ ہماری خواہش ہے کہ مذکورہ صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک " چھینک مار ایسوسی ایشن" قائم کی جائے جس کے ارکان یہ حلف اٹھائیں کہ وہ جہاں چار آدمی جمع دیکھیں وہاں چھینک مار دیں گے اور ایسا کرتے وقت ان کا انداز معذرتی نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے فوراً بعد ان کے حلق سے "الحمد للہ" کی خاصی گاڑھی صدا بھی برآمد ہو گی۔ اس ضمن میں ہمیں اگر کوئی خدشہ ہے تو صرف یہ کہ "چھینک مار" دوست جلدی اپنے اس رویے سے کنارہ کشی نہ کر لیں۔ کیونکہ ماضی میں ہم نے بڑے بڑے "چھینک ماروں" کو دیکھا ہے جو "اسلام آبادی جوشاندے" کی ایک خوراک سے ایسے "صحت یاب" ہوئے کہ اب اگر کبھی بھولے سے انہیں چھینک آجاتی ہے تو فوراً "ایکسکیوزمی" کہہ کر ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں۔

۲۳ رمئی ۱۹۷۵ء

اڈّا پہلوان!

گو ہم فلم دیکھنے کے بھی خاصے شوقین ہیں مگر فلم خصوصاً انگریزی فلموں کی " اسٹوری" سننے کا تو ہمیں جنون ہے مگر اسی صورت میں اگر یہ "اسٹوری" سنانے والا ہمارا یار اڈّھا پہلوان (ٹھنڈی کھوئی والا) ہو۔ اڈّھا پہلوان کو بچپن میں اس کے باپ نے "اعلیٰ تعلیم" کے لئے کارپوریشن سکول میں داخل کروایا تھا۔ لیکن یہاں اسے اپنی "صلاحیتوں" کو زنگ لگتا محسوس ہوا اور وہ اکثر سکول سے غائب رہنے لگا۔ اِدھر اس کا باپ محسوس کر رہا تھا کہ دکان پر بیٹے کی عدم موجودگی کی وجہ سے کڑاھائیوں کو زنگ لگ رہا ہے لہٰذا اس نے آڈھے پہلوان کو دوبارہ دکان پر بٹھا دیا چنانچہ وہ اس روز سے آدھا وقت کڑاھیاں مانجھنے میں صرف کرتا ہے اور آدھا وقت احباب کو کسی تازہ دیکھی ہوئی انگریزی فلم کی سٹوری سنانے میں مشغول رہتا ہے۔

ہم دوپہر کو اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر اس کی دکان کے سامنے سے گذرتے ہیں تو وہ اپنے احباب پھیکا گجر، اور غلام نبی خرادیئے وغیرہ کے جھرمٹ میں آدھی سڑک گھیرے مونڈھے پر بیٹھا نظر آتا ہے وہ اس سے پورے انہماک کے ساتھ کسی فلم کی کہانی سن رہے ہوتے ہیں ہمیں دور سے آتا دیکھ کر اڈھا پہلوان وہیں سے بیٹھے بیٹھے پوچھتا ہے۔

"قاشمی شاب! آپ نے نابالغ حسینہ دیکھی ہے؟"

ہم اس قدر ذاتی سا سوال سن کر نروس ہو جاتے ہیں۔ تاہم وہ ہماری گھبراہٹ تاڑ لیتا ہے اور اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

" اجی، وہی نابالغ حسینہ جو صرف بالغوں کے لئے ہے اور ان دنوں " اصلاح معاشرہ " سینما میں چل رہی ہے ؟ "

یہ سن کر ہم اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور ماتھے پر سے عرقِ ندامت پونچھتے ہوئے اس کے قریب پہنچ جاتے ہیں اس پر وہ آواز لگاتا ہے۔

" اوئے چھوٹے دسیندا نئیں باؤ ہوراں کھلوتے ہوئے نیں .... (سنسرڈ) ایناں لئی سٹول لے کے آ ..... (سنسرڈ) "

جب وہ بزعم خود ہماری اچھی طرح عزت افزائی کر چکتا ہے اور ہم یونہی خود کو بے عزت محسوس کر بیٹھتے ہیں۔ نیز دریں اثنا " چھوٹا " اندر سے سٹول بھی لے آتا ہے تو ہم اس کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔

" قاشمی شاب، فلم دیکھنے کے قابل ہے، بس ایک دفعہ دیکھ آیئے "

" کیوں بھئی، آخر کیا ہے اس میں ؟ " ہم دانستہ یہ سوال پوچھتے ہیں!

" اسٹوری اس کی یہ ہے " خدا اسے ایسا موقع دے۔ چنانچہ وہ شروع ہو جاتا ہے :۔

" ہیرو اپنے کمرے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہوتا ہے اتنے میں ہیروئن ٹخنوں سے اونچا گھگرا (منی سکرٹ) پہنے اندر داخل ہوتی ہے ہیرو ایک بار نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا ہے اور دوبارہ کتاب پڑھنے لگتا ہے۔ ہی ہی ہی، ہے نا عجیب بات۔ یہ دیکھ کر ہیروئن " کچھ " کہتی ہے، آگے سے ہیرو بھی " کچھ " کہتا ہے۔ پھر ہیروئن " کچھ " کہتی ہے اور اس کے بعد ہیرو پھر " کچھ " جواب دیتا ہے۔ اس پر یہ غصے میں زور زور سے " کچھ " بولنے لگتی ہے وہ اس سے زیادہ زور سے " کچھ " کہتا ہے۔ اور پھر دونوں لڑ پڑتے ہیں۔ ہیرو زور سے اسے ایک " ریپٹا " دیتا ہے اور وہ آگے سے چیختی ہوئی کہتی ہے پتہ نہیں کیا کہتی ہے لیکن کیا بات ہے قاشمی شاب اسٹوری کی آپ یہ فلم ضرور دیکھیں "

اڈھے پہلوان سے ایسی " اڈی پچڈی " کہانیاں سن سن کر ہم بھی آہستہ آہستہ اس کے رنگ میں رنگے جا رہے ہیں چنانچہ اب تو یہ عالم ہے کہ کوئی دوست کسی فلم ہی کی نہیں کسی جلسے جلوس کی کہانی بھی ہمیں سنانے کے لئے کہتا ہے تو ہم اسے اسی طرح کی " اڈی پچڈی " کہانی سناتے ہیں مثلاً " گذشتہ دنوں ہم نے ایک جلسے میں عوام کی حیثیت سے شرکت کی اور دوستوں نے

اس کی "اسٹوری" سنانے کو کہا تو ہم نے انہیں بتایا کہ پہلا مقرر جب سٹیج پر آیا تو اس نے "کچھ" کہا پھر دوسرے مقرر نے "کچھ" کہا پھر تیسرے مقرر نے "کچھ" کہا۔ حتیٰ کہ سب مقرروں نے "کچھ" کہا ہماری زبانی اس نوع کی کہانی سن کر احباب خاصے ناراض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم سٹوری سنا رہے ہو۔ یا کسی اخبار کے لیے رپورٹنگ کر رہے ہو مگر ہم یہ طعن وتشنیع گول کر جاتے ہیں کہ جانتے ہیں یہ سب تماشبیں ہیں۔

ہم جو آدھی کہانی سناتے ہیں اور وہ جو پوری کہانی سننا چاہتے ہیں۔ سب اڈھے پہلوان ہیں ہماری آدھی عمر کڑھائیاں مانجھتے گذر گئی ہے باقی بھی گذر ہی جائے گی۔

۲۹ مئی ۷۵ء

ـــــــ برقعہ پوش خطوط

پردے کی کئی قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے جسکے مطابق بعض بزرگ خطوط میں بھی بیبیوں کو برقعہ اوڑھا دیتے ہیں، تاہم گزشتہ روز اس نوع کا ایک خط ہم ایسے "نامحرم" کے ہاتھ لگ گیا، جس کی عبارت کچھ یوں تھی کہ "عزیزہ پ، ر سے کہنا کہ وہ غ۔ل کے پاس جائے اور اس سے پوچھے کہ ر۔ن نے ابھی تک خ۔ل سے مل کر س۔ ر سے ش۔ہ کا کام کروایا ہے یا نہیں" بعد از خرابی بسیار ہماری تحقیق کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہ عزیزہ پ، ر دراصل پروین ہے، جس سے کہا گیا ہے کہ وہ غ۔ل یعنی غزالہ کے پاس جائے اور اس سے پوچھے کہ ر۔ن یعنی رخسانہ نے ابھی تک خ۔ل یعنی خالدہ سے مل کر س۔ ر یعنی سرفراز سے ش ہ یعنی شہناز کا کام کروایا ہے یا نہیں؟

۲۸ جون ۱۹۷۷ء

چل چل چنبیلی باغ میں

ہمارے ہاں ایسے بہت سے افراد اور ادارے کام کر رہے ہیں جو اپنے "کلائنٹس" (CLIENTS) کو "چل چل چنبیلی باغ میں میوہ کھلاؤں گا" کا جھانسہ دے کر "چنبیلی باغ" لے جاتے ہیں اور وہاں میوہ کھلانے کی بجائے الٹا ان کی جیبیں کاٹ لیتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا "چنبیلی باغ" ہے لیکن میوہ ایک ہی ہے جس کا ذائقہ بہت تلخ ہے۔ مثلاً نوجوانوں میں ایک طبقہ ایسا ہے جو شادی کی خواہش مند بھولی بھالی لڑکیوں کو چنبیلی باغ چلنے اور وہاں پہنچ کر میوہ کھلانے کی پیش کش کرتا ہے، لیکن اس باغ میں لے جا کر وہ میوہ خود کھاتا ہے اور لڑکی کو تمام عمر کے لئے بھیگی آنکھوں کا تحفہ دے جاتا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو ملکی حالات سے دل برداشتہ نوجوانوں کو غیر ممالک بھجوانے کا جھانسہ دیتا ہے۔ گاہکوں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا ہے اور پھر انہیں بیچ منجدھار میں چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ ایسا ہے جو شادی بیاہ کا ادارہ قائم کرتا ہے اور پھر اخباری اشتہارات کے ذریعے بے شمار لوگوں کو اس "چنبیلی باغ" میں چلنے کی دعوت دیتا ہے وہ بے چارے اس دعوتِ عام پر چلے بھی آتے ہیں لیکن "میوہ" یہ حضرت خود کھا جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کو "چل چل چنبیلی باغ میں میوہ کھلاؤں گا" کا جھانسہ دے کر ایسی راہ پر لگا دیتے ہیں جو انہیں ان کی مثالی منزل سے بہت دور لے جانے والی ہوتی ہے ایک گروہ جعلی پیروں کا ہے جو روحانیت کے چنبیلی باغ کی طرف بلاتے ہیں اور وہاں لے کر میوہ کھلانے کی بجائے مریدوں کے باقاعدہ کپڑے اتار لیتے ہیں۔

تاہم "چل چل چنبیلی باغ میں میوہ کھلاؤں گا" کی پیش کش سے اگر سب سے زیادہ کسی نے فائدہ

اٹھایا ہے تو وہ افریقہ اور ایشیا وغیرہ کے پسماندہ ممالک کی سیاسی جماعتیں ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ "سلوگن" ان ممالک کی تمام سیاسی پارٹیوں کا مشترکہ منشور رہا ہے چنانچہ ہوتا یوں آیا ہے کہ پارٹی لیڈر نے مجمع لگانے کے لیے "چل چل چنبیلی باغ میں" کا نعرہ لگایا اور لوگ اس کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے۔ اس کے بعد یہ لیڈر جلوس کی صورت میں انہیں چنبیلی باغ کی طرف لے کر چل پڑا مگر جب یہ جلوس رہنما کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ چنبیلی باغ نہیں "سبز باغ" تھا اور یہاں انہیں میوہ کھلانے کے لیے نہیں، الٹا ان سے میوہ کھانے کے لیے لایا گیا تھا لیکن میوے کی کشش کچھ ایسی ہے کہ اگلی بار پھر کسی نے گھوڑا ہنکانے ہی کے انداز میں بھی "چل چل" کہا تو یہ اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ اس سے اگلی بار بھی ایسے ہی ہوتا ہے اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ کافی عرصہ تک یونہی جاری رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آتا ہے جب لوگ برافروختہ ہو جاتے ہیں اور "چنبیلی باغ" پہنچ کر پورے شد و مد سے میوے کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں

لیکن ان ممالک کے عوام پھر "کالانعام" ہیں اور رہنما پھر "رہنمایانِ کرام" ہیں سو ایسی تشویش ناک صورتِ حال میں بھی نہ ان کے قدم ڈگمگاتے ہیں اور نہ میوہ کھلانے سے معذوری کا اظہار کرتے ہیں بلکہ عوام کو بتاتے ہیں کہ دراصل میوے کی ٹہنی ٹوٹ گئی ہے اور اسے "سینے" کے لئے درزی بلایا گیا ہے۔ بس کچھ عرصہ اور انتظار کرو۔ عوام کچھ عرصہ مزید انتظار کرتے ہیں اور پھر "رولا" ڈالنے لگتے ہیں۔ اس پر کہا جاتا ہے کہ درزی کی سوئی ٹوٹ گئی ہے اور اسکی مرمت کیلئے لوہار کا انتظار ہے چنانچہ عوام لوہار کا انتظار کرنے لگتے ہیں جب وہ نہیں پہنچتا تو بتایا جاتا ہے کہ لوہار کو بلانے کیلئے گھوڑا بھیجا گیا ہے۔ بس اب وہ آیا ہی چاہتا ہے لیکن ایک عرصے بعد بھی لوہار نہیں پہنچتا تو رہنما یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ دراصل گھوڑے کا پاؤں ٹوٹ گیا ہے اور اس پر ہلدی لگائی جا رہی ہے۔ گھوڑے کو مبینہ طور پر ہلدی لگائے بھی ایک عرصہ گزر جاتا ہے مگر اس کے باوجود وہ ایک قدم آگے اٹھاتا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ اب ان علاقوں کے عوام ایک عرصے سے منتظر ہیں کہ کب یہ گھوڑا اپنی خودی بلند کرے اور پھر یہ "خدا" اپنے ان "بندوں" سے پوچھیں کہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟ اور آگے سے یہ کورس میں کہیں "میوہ" مگر فی الحال یہ نوبت نہیں آئی اور عوام حیران ہیں کہ آخر یہ نوبت کیوں نہیں آئی؟ حالانکہ یہ نہیں جانتے اگلے بیس بائیس لوگ گزشتہ کئی برسوں سے ان کے حصے کا میوہ کھانے میں مشغول ہیں اور اگر یہ اسی طرح پچھلی لائن میں لگے جمائیاں لیتے رہے تو انہیں مزید ایک طویل عرصے تک یہی سننا پڑے گا کہ میوے کی ٹہنی ٹوٹ گئی ہے۔ درزی بلایا گیا ہے، درزی کی سوئی ٹوٹ

گئی ہے۔ لوہار کو لانے کے لیے گھوڑا بھیجا گیا تھا مگر اس کا پاؤں زخمی ہو گیا ہے اس زخمی پاؤں پر ہلدی لگائی جا رہی ہے اور بس اب میوہ تیار ہوا چاہتا ہے، کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

۷ر جون ۱۹۷۵ء

طوالتِ عمر

اخبارات میں اس نوع کی خبریں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں بتایا گیا ہوتا ہے کہ دنیا کے فلاں ملک میں ایک شخص سوا سو یا ڈیڑھ سو برس کی عمر پاکر گزشتہ روز اس دارفانی سے کوچ کر گیا۔ خبر کے ساتھ عموماً بزرگ کی اس طوالتِ عمر کی وجہ بھی بتائی گئی ہوتی ہے مثلاً کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ موصوف نے پیدائش کے دس منٹ بعد ہی "ایکسکیوزمی" کہہ کر دائی سے اجازت طلب کی تھی اور چھڑی پکڑ کر "واک" (WALK) کو نکل گئے تھے اس کے بعد ساری عمر ان کا یہی معمول رہا کہ صبح شام پانچ چھ میل کی "چہل قدمی" ضرور کرتے تھے۔ یا طوالتِ عمر کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ موصوف ہر کام وقت پر کرنے کے عادی تھے۔ سوتے وقت پر تھے جاگتے وقت پر تھے اور کھانا وقت پر کھاتے تھے حتیٰ کہ موصوف کسی سیاسی جماعت میں بھی ٹھیک وقت پر شریک ہوتے تھے اور ٹھیک وقت پر اس سے علیحدگی کا اعلان کرتے تھے

۲ر نومبر ۱۹۷۵ء

آقاؤں کے لیے ایک کالم!

بظاہر نئے اور پُرانے زمانے میں بہت فرق نظر آتا ہے لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو فرق کچھ اتنا زیادہ نہیں مثلاً پُرانے زمانے میں غلامی کا باقاعدہ "ادارہ" موجود تھا۔ انسانوں کی منڈیاں لگتی تھیں "گاہک" آتے تھے اور "مال" پسند کر کے لے جاتے تھے۔ اس کے بعد ان غلاموں کی پیشانیاں داغ دی جاتی تھیں، تاکہ وہ اگر فرار ہونے کی کوشش کریں اور کہیں بھی پناہ گزیں ہوں تو پہچانے جائیں ان دِنوں یہ ہے کہ گو انسانوں کی باقاعدہ منڈیاں نہیں لگتیں۔ تاہم ان کی خرید و فروخت کا کاروبار آج بھی کھُلے بندوں ہوتا ہے بلکہ آج کے مہذب دور میں تو غلاموں کی کوالٹی (QUALITY) بھی بہتر ہوگئی ہے۔ چنانچہ ان دِنوں بلند پایہ سیاست دان، ادیب، شاعر، دانشور، مصور، علماء، استاد اور صحافی سبھی بکاؤ مال بن کر رہ گئے ہیں بس فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے زمانے میں غلاموں کی پہچان کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس نئے زمانے کے آقا کوشش کرتے ہیں کہ ان کے غلام پہچانے نہ جائیں۔

چونکہ ہم بھی غلام معاشرے کے ایک غلام فرد ہیں۔ اپنے آقاؤں کا نمک کھاتے ہیں اور اپنے آقاؤں سے زیادہ آقاؤں کے وفادار ہیں۔ اس لئے ہمارا "نمک حلالانہ" مشورہ یہ ہے کہ اب غلاموں کو چھپانے کی بجائے ہر شعبۂ زندگی میں موجود خاص الخاص غلاموں کی پہچان کا انتظام کیا جائے۔ کیونکہ جب کوئی نئی حکومت آتی ہے۔ یہ غلام اپنے پہلے آقاؤں سے مل جاتے ہیں اور اس کے بعد جب اس نئی حکومت کے دن بھی گنے جاتے ہیں۔ تو یہ نئے آقاؤں کے لئے چشم براہ نظر آنے لگتے ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو یہ غلام کسی کے وفادار نہیں ہوتے۔ اس لئے یہ بات ہر دور کے آقاؤں کے حق میں جاتی

ہے کہ وہ ان غلاموں کی پہچان کا بندوبست کریں تاکہ ہر دور میں پوری پہچان پھٹک کے بعد ان کی خدمات سے استفادہ کیا جائے۔ اس ضمن میں یہ احتیاط برتی جاسکتی ہے کہ عوام الناس کو اس پہچان کا علم نہ ہونے پائے کیونکہ موجودہ دور میں اگر عوام ان غلاموں کو پہچان جائیں تو پھر یہ غلام کسی صورت میں بھی اپنے آقاؤں کے کام کے نہیں رہتے۔ لہٰذا شناخت کے لئے کوئی ایسا "کوڈ" ذریعہ اختیار کیا جانا چاہیئے۔ جو صرف آقاؤں کے مابین رہے اس ضمن میں ہمارے پاس کچھ تجاویز ہیں۔ جو ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں میں موجود غلاموں کے ذیل میں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ انہیں پیلے رنگ کی قمیص اور کالی پتلونیں پہننے کا حکم دیا جائے اس سے بظاہر وہ ٹیکسی لگیں گے۔ تاہم اس سے ان کی عزت نفس کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ کیونکہ غلاموں میں عزت نفس نام کی کوئی چیز سرے سے موجود نہیں ہوتی۔ غلام صحافیوں کے لئے ہماری تجویز یہ ہے کہ انہیں خفیہ طور پر میٹر لگائے جائیں تاکہ نئے آقاؤں کو پتہ چل سکے کہ اس سے پہلے وہ کتنا چل چکے ہیں۔ "خاندان غلاماں" کے علمائے کرام کے لئے ہم تجویز کریں گے کہ ان کے گلوں میں "امیر کی اطاعت تم پر واجب ہے" کے کلمات تعویز کی صورت میں لٹکا دیئے جائیں کہ وہ یوں بھی عوام کو اس طیب جملے کے خبیث معنی بتاتے ہیں۔ غلام استادوں کے لئے یہ حکم ہونا چاہیئے کہ وہ نہ صرف اپنے "ماسٹر" کے سامنے بلکہ عام معاشرتی زندگی میں بھی خود کو "ماسٹر" کہلوانا ترک کر دیں تاکہ ان کی اس بہانے شناخت ہو سکے۔ غلام سیاست دانوں کے بارے میں ہماری تجویز یہ ہے کہ ان کے لیے ایک باقاعدہ یونیفارم مقرر کیا جانا چاہیئے اور وہ کچھ یوں کہ یہ لوگ باقاعدہ مونچھیں رکھیں کاندھے پر "پرنا" ماریں اور سر پر ترچھی ٹوپی رکھیں کہ نہ صرف خود غلام ہیں بلکہ ہر دور میں اپنے آقاؤں کے لئے عوام کی باقاعدہ "دلالی" بھی کرتے آئے ہیں۔

یہ کالم ہم نے دنیا بھر کے آقاؤں کے لئے لکھا ہے اور اس میں جو تجاویز ہیں، وہ انتہائی کنفیڈنشل ہیں لہٰذا عوام سے درخواست ہے کہ وہ یہ کالم نہ پڑھیں اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارے اردگرد موجود ادبی، سیاسی، صحافتی اور مذہبی غلاموں کی پہچان ہو جائے گی۔ جس سے ہماری تجاویز کا مقصد غارت ہو کر رہ جائے گا کیونکہ ان تجاویز سے مقصود آقاؤں کو محض ہر دور کے غلاموں کی شناخت کرانا ہے۔ عوام میں ان کی شناخت پریڈ کرانا نہیں ہے!

۱۱ر جون ۱۹۷۵ء

گربۂ مسکین!

قریباً دس برس قبل ایک مقامی معاصر میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ضلع کچہری کے عملہ میں ایک عدد بلّی بھی شامل ہے۔ یہ بلّی باقاعدہ سٹاف میں شامل تھی اور اسے پانچ روپے ماہوار پر ملازم رکھا گیا تھا۔ اس کے فرائض میں ان چوہوں کا شکار شامل تھا جو ضلع کچہری کی فائلوں کا ناس مار دیتے تھے۔ اس کے لئے جو ماہوار تنخواہ مقرر کی گئی تھی، اس کی ادائیگی رقم کی بجائے جنس کی صورت میں ہوتی تھی یعنی اسے ہر ماہ پانچ روپے کا دودھ پلا دیا جاتا تھا۔

ہم نے یہ بلّی نہیں دیکھی، تاہم یہ خبر شائع ہونے کے بعد جن لوگوں کو اسے دیکھنے کا موقع حاصل ہوا تھا، وہ اس کے لئے بہت رطب اللسان ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یہ بلّی اپنی ڈیوٹی یعنی چوہے شکار کرنے کے ضمن میں بہت مستعد تھی کیونکہ یہ ہر وقت "گربۂ مسکین" بنی رہتی تھی۔ اور چونکہ چوہے اس سے کوئی خطرہ محسوس نہ کرتے تھے اس لئے بآسانی اس کا لقمہ بن جاتے تھے۔ یہ بلّی آج کل ضلع کچہری کے سٹاف میں شامل ہے یا نہیں، اس بارے میں کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی، تاہم ہم نے مختلف صحافیوں سے اس ضمن میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان لوگوں کو باخبر طبقہ سمجھا جاتا ہے، مگر انہوں نے ایک دوسرے سے قدرے متضاد معلومات فراہم کی ہیں۔ مثلاً ایک رپورٹر کا کہنا ہے کہ ایوب خان کے زمانے میں اس گربۂ مسکین کو خطرناک سیاست دان سمجھ کر "ایبڈو" کر دیا گیا جس کے ساتھ ہی اسے نوکری سے بھی جواب مل گیا۔ ایک دوسرے دوست نے بھی اس کی برطرفی کی خبر سنائی ہے مگر ان کی روایت یہ ہے کہ یہ برطرفی یحییٰ خاں کے زمانے میں تین سو تین افسروں کے ساتھ ہوئی ان کا کہنا ہے کہ اس کا شمار گو افسروں میں نہیں ہوتا تھا

مگر اسے لچھن افسروں والے ہی تھے کیونکہ تحقیقات کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ اس کی ماہوار تنخواہ گو پانچ روپے ہے مگر وہ اکثر گلچھرے اڑاتی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک اور صحافی بھائی کے مطابق بھی برطرفی والی یہ اطلاع درست ہے مگر یہ اقدام موجودہ حکومت کے دوران ۱۴ سو سرکاری ملازموں کی برطرفی کے دوران ہوا ہے۔ کیوں کہ "پیپلز پارٹی" کے کچھ عہدیداروں سے چوہوں ہی کے مسئلہ پر اس کی کچھ ان بن ہوگئی تھی۔ تاہم ایک صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ بلی کو "ڈس مس" نہیں کیا گیا۔ بلکہ ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچنے کے بعد وہ باعزت طور پر ریٹائر ہوئی ہے۔ ایک گھاگ صحافی نے بھی اس سے ملتی جلتی اطلاع فراہم کی ہے مگر اس کا کہنا ہے کہ بلی نے ریٹائرمنٹ کی مدت میں توسیع کی درخواست دی تھی جو منظور کرلی گئی کیونکہ اس نے تمام ادوار میں مختلف النوع چوہے شکار کرنے کے ضمن میں بڑی گرانقدر خدمات انجام دی تھیں چنانچہ ان دنوں وہ بلی نہ صرف یہ کہ اپنی ملازمت پر موجود ہے، بلکہ اسے جلیبیوں کی رکھوالی پر بھی بٹھا دیا گیا ہے۔!

ان تمام اطلاعات میں سے ہمیں یہ آخری خبر زیادہ معتبر معلوم ہوئی ہے کیونکہ جو بلی چوہے شکار کرنا جانتی ہے۔ وہ بھوکوں نہیں مر سکتی۔ اور یوں ہمیں یقین ہے کہ یہ بلی نہ صرف یہ کہ ان دنوں بھی اپنی ملازمت پر موجود ہے بلکہ یہ بات کافی حد تک قابلِ قبول ہے کہ اس کے درجات بھی بلند ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ ہمارے نزدیک اگر کوئی امر تحقیق طلب ہے تو یہ کہ آیا وہ ابھی تک ضلع کچہری ہی میں متعین ہے یا اس کی خدمات صوبائی سیکرٹریٹ میں منتقل کر دی گئی ہیں۔ بلکہ یہاں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ترقی کرتے کرتے اسلام آباد پہنچ گئی ہو اور وہاں مختلف محکموں میں چوہے شکار کرنے پر مامور بلیوں کی مشیر مقرر ہوگئی ہو۔ ایک امکان یہ بھی ہے اور اسے بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ترقی کی اتنی منازل طے کرنے پر اپنی اوقات بھلا بیٹھی ہو اور یوں شکار کرتے وقت اسے اپنے پرائے چوہے کی پہچان بھی باقی نہ رہی ہو۔ جس کے نتیجے میں اس کی خدمات بیرونِ ملک کسی پاکستانی سفارت خانے میں منتقل کر دی گئی ہوں۔ تاہم یہ سب قیاسات ہیں اور یوں اس ضمن میں کوئی سو فی صد درست بات نہیں کی جا سکتی چنانچہ کوئی پتہ نہیں کہ ترقی یا تنزل کے یہ سب قیاسات محض قیاسات ہی ہوں اور وہ ابھی تک ضلع کچہری میں پرانی تنخواہ ہی پر کام کر رہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو گو بہت افسوس ناک ہے لیکن یہ پہلا واقع نہیں کیونکہ ہمارے ہاں ایسی بہت سی بلیاں موجود ہیں جن کی تمام عمر چوہے شکار کرنے میں گزری ہے۔ مگر

انہیں گلہ ہے کہ زمانے نے ان کی قدر نہیں کی۔

۱۹ رجون ۷۵ء

لنڈا جیوے

لنڈے بازار کا ایک پھیرا لگانے سے ایک راز ہم پر یہ منکشف ہوا کہ صرف کپڑے لتے ہی پرانے ہو کر اس بازار میں نہیں پہنچتے بلکہ تحریکیں اور سلوگن بھی اپنی وقعت کھو بیٹھیں تو وہ بھی بالآخر لنڈا بازار ہی پہنچتے ہیں۔ مثلاً "جیوے جیوے بھٹو جیوے" والے نعرے نے یہاں اپنی ایک نئی معنویت دریافت کی ہے چنانچہ بازار میں داخل ہوتے ہی بڑی دکانوں سے پہلے قطار اندر قطار بچھی ہوئی چارپائیوں پر سجی دوکانیں نظر آئیں جن کے قریب کسی بلند جگہ پر کھڑے ہنکارے "جیوے جیوے لنڈا جیوے" کے نعرے لگاتے تھے اور بھنگڑا ڈالتے تھے۔ اس سے ذرا آگے جو ہنکارے تھے انہوں نے فضا میں پرانے کپڑے بلند کئے ہوئے تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

بیچیں گے جی بیچیں گے آٹھ روپے میں بیچیں گے

ذرا زور سے بولو
بیچیں گے
ہم مال پرانا بیچیں گے

اگلی چارپائی پر کھڑا ہنکارہ غالباً "زلفین" کی "ہنگامہ آرائی" سے بے حال ہو چکا تھا وہ اپنی پانچوں انگلیاں خاموشی سے فضا میں بلند کرتا اور تھکے لہجے میں ہولے ہولے کہتا تھا "پنج روپے پنج روپے"!

۲۲ردسمبر ۱۹۷۷ء

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی!

روحی کنجاہی نظر بد دور نوجوان شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، ان کی غزل میں عہدِ جدید کے تمام تر تقاضے پوری خوب صورتی کے ساتھ در آئے ہیں اور یوں ان کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے لمحۂ موجود سے اغماض نہیں برتا اور لمحۂ موجود نے بھی انہیں نظر انداز نہیں کیا۔ مگر یہاں ذکر ان کی مکمل شاعری کا نہیں بلکہ صرف اس ایک مصرعے کا ہے جو ان کی ایک غزل میں شامل ہے اور وہ مصرعہ کچھ یوں ہے۔ ع حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

ہم جوں جوں اسی مصرعہ کی معنویت پر غور کرتے ہیں اسی قدر اس کے معانی پہلے سے زیادہ واضح ہو کر ہمارے سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک سیدھا سادا سا مصرعہ ہے مگر اس کا سیدھا پن جلیبی کی طرح کا ہے کیونکہ آپ کسی بھی شاعر کا کوئی بھی شعر لے کر اس کے آخر میں یہ مصرعہ لگا دیں، اس شعر کی معنویت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ مثال کے طور پر یہ تین چار شعر بمعہ اضافہ ملاحظہ فرمائیں۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

روحی کنجاہی کا یہ مصرعہ صرف شاعری ہی کے ضمن میں "رابطہ افزا" کا کام نہیں دیتا بلکہ اگر آپ نے اس کی معنویت کے کچھ مزید جوہر دیکھنا ہوں تو اسے ان خبروں اور بیانات کے ساتھ فِٹ کر کے دیکھیں جو آئے روز جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتے ہیں، چنانچہ یہ مصرعہ فِٹ کرنے سے ان کی شکل وصورت کچھ اس طرح کی نکل آئے گی۔

"پنجاب میں کھر اور رامے کی جگہ نئی تقرریوں کا امکان"
حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

"کچھ مزید صنعتیں قومی تحویل میں لی جائیں گی"
حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

"اپوزیشن کی طرف سے اسمبلیوں کا بائیکاٹ جاری ہے"
حالانکہ اس سے فرق تو پڑتا نہیں کوئی

روحی کنجاہی کے متذکرہ مصرعہ کی اور بھی بہت سی جہتیں ہیں اور ان کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ یہ سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا، اگر ہمیں طوالت کا خیال نہ ہوتا اور روحی کنجاہی کے ملول ہونے کا خدشہ نہ ہوتا نیز اپنی چمڑی بچانے کا خیال بھی ذہن میں جاگزیں نہ ہوتا تو ہم اس ضمن میں کچھ ایسی مثالیں بھی پیش کرتے کہ مختلف حلقوں کی طرف سے اس مصرعہ پر پابندی لگانے کا مطالبہ کر دیا جاتا اور اس کی حمایت حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف دونوں طرف سے ہوتی مگر ہم اتنا لکھنے پر بھی روحی کنجاہی سے شرمندہ ہیں اور ان سے معافی چاہتے ہیں۔ حالانکہ اس سے فرق

توڑتا نہیں کوئی!

۱۲ر جولائی ۸۳ء

گھڑی گھڑی

ڈھو رہے کسی مخالف سیاسی جماعت کے جلسے میں اتنی زیادہ تعداد میں پہنچ جاتے ہیں کہ وہاں اپنا ہجوم دیکھ کر DEMORALISE ہونے لگتے ہیں یہ دراصل مقرر کی تقریر کم سنتے ہیں، اس تقریر سے "صحیح وقت" کا اندازہ زیادہ لگاتے ہیں اِدھر لاہور کے مقرر بھی ایسے ہیں کہ تقریر کم کرتے ہیں اور ٹائم زیادہ بتاتے ہیں مثلاً ان جلسوں میں یہ شعر بہت پڑھا جاتا ہے ؎

یہ "گھڑی" محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر ناداں اگر کوئی عمل دفتر میں ہے۔

چھوٹا مقرر اگر "گھڑی" کا ذکر کرتا ہے تو بڑا مقرر "گھڑیال" کا حوالہ درمیان میں لے آتا ہے۔

غافل تجھے "گھڑیال" یہ دیتا ہے منادی

جو مقرر گھڑی یا گھڑیال کا براہِ راست ذکر نہیں کرتا وہ بالواسطہ طور پر وقت کی دہائی دینے میں لگا رہتا ہے مثلاً یہ کہ "حضرات میرے پاس تقریر کے لیے "وقت" بہت کم رہ گیا ہے مجھے آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ قربانیاں دینے کا "وقت" آگیا ہے آپ اس کے لیے "ہمہ وقت" تیار رہیے۔

۸ر اکتوبر ۷۷ء

ہدایت نامہ

ہم فطرتاً بڑے رفیق القلب واقع ہوئے ہیں، کسی کو پریشانی میں دیکھ کر خود پریشان ہو جاتے ہیں، چنانچہ اِن دنوں ہم سے امیدواران وزارت کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی۔ اس نوع کا کرب یا توہم نے میٹرک کا نتیجہ نکلنے سے پہلے امیدوار طلبہ کے چہروں پر دیکھا ہے اور یا پھر اب امیدوارانِ وزارت کے چہروں پر دیکھ رہے ہیں۔ ان میں سے کئی اگرچہ خاصے پُر اُمید ہیں، مگر اس کے باوجود تذبذب کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ اور جو مایوس ہیں وہ اتنے مایوس ہیں کہ مایوس مریض لگتے ہیں حالانکہ انہوں نے بھی یہ اشتہار کئی بار ملاحظہ کیا ہوگا۔ جس پر "مایوسی گناہ ہے" کی سُرخی درج ہوتی ہے۔ ہم نے ایسے مایوس مریضوں کے لئے کوئی کلینک تو نہیں کھولا، البتہ ایک کتابچہ بعنوان "ہدایت نامہ برائے امیدوارانِ وزارت" ضرور ترتیب دیا ہے، جس میں مجوزہ ہدایات پر عمل پیرا ہونے سے انشاءاللہ مکمل شفا نصیب ہوگی اور دوشیزۂ وزارت کے حصول میں شرمندگی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

اس ہدایت نامے کیمطابق اے امیدوارانِ وزارت آپکے کرنے کا کام یہ ہے کہ صوبائی اور مرکزی دونوں سطح پر "رابطۂ خواص" کی مہم تیز تر کر دیں۔ اپنے وجود کا احساس دلائیں اور وجود کا احساس دلانے کے مختلف طریقے ہیں۔ مثلاً کسی نجومی سے رابطہ قائم کرکے اس کی یہ پیش گوئی اخبار میں شائع کروائیں کہ وزیرِ اعلیٰ پنجاب کی کابینہ کے متوقع ارکان میں ان صاحب کی شمولیت یقینی ہے اس طرح ان دِنوں میں اخباری بیانات کا سلسلہ نہ صرف یہ کہ جاری رہنے دیا جائے بلکہ اسمیں کچھ شدت پیدا کی جائے۔ مثلاً اگر پرہیز کریں۔ آپ کی نظریں ہمیشہ جھکی رہنی چاہیئں: ایک تو اصولاً اور دوسرے مصلحتاً۔ مصلحتاً اس لئے

کوئی بحران ہو تو اس کے بارے میں بیان جاری کیا جا سکتا ہے، لیکن بالفرض محال اگر کوئی بحران موجود نہ ہو تو بحران پیدا کیا جائے تاکہ بیان کا جواز پیدا ہو سکے۔ نیز ایسا کرتے وقت اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے بیان کے ساتھ اپنی ایسی تصویر شائع کرانے کی کوشش کریں۔ جس میں آپ کم سے کم جرائم پیشہ نظر آتے ہوں۔ علاوہ ازیں اپنے وجود کا احساس دلانے کے لئے طاقت کا مظاہرہ بھی بہت ضروری ہے، اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ آپ وزیرِ اعلےٰ یا وزیرِ اعظم کے سامنے ڈنڈ بیٹھکیں نکالنا شروع کر دیں بلکہ اس سے مراد سیاسی قوت کا مظاہرہ ہے۔ مثلاً یہ کہ استقبال وغیرہ کے لیے آپ پارٹی یا پارٹی سے باہر کے کتنے کارکن اپنے ہمراہ لا سکتے ہیں۔ اسمبلی میں آپ کے "ہم پیالہ و ہم نوالہ" ارکان کتنی تعداد میں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ آپ ان دنوں" اپائنٹنگ اتھارٹی" کو بار بار "چھیڑا" کرائیں مگر اس سلسلے میں خاصی احتیاط کی ضرورت ہے۔ احتیاط میں فائدہ اور عدم احتیاط میں خاصے نقصان کا احتمال ہے۔ آپ نے یہ خبر پڑھی ہو گی کہ وزیرِ اعظم کے دورۂ ملتان کے موقع پر ایک سابق وزیر چہرہ نمائی کے شوق میں اتنے آگے نکل گئے کہ وزیرِ اعظم کے آگے آگے چلنے لگے۔ اس پر جناب کھرنے انہیں سختی سے ڈانٹا اور فرمایا کہ اپنی اوقات میں رہو۔ اس کے برعکس چینوٹ میں ایک امیدوار وزارت ہانپتے کانپتے وزیرِ اعظم کے پیش ہوئے جھک کر انتہائی مؤدبانہ طور پر سلام کیا اور خیر خیریت دریافت کی۔ اس پر جناب بھٹو نے کہا کہ" میں بہت زیادہ مصروف رہا ہوں۔ اس لئے آپ سے بات نہ کر سکا اب بھی ملتان جا رہا ہوں، وہاں سے فارغ ہونے کے بعد بات کروں گا، ویسے آپ فکر نہ کریں۔"
اس آخری فقرے میں امیدوار وزارت کے لیے شربتِ فولاد کی کم از کم تین بوتلوں کی قوت موجود ہے، جس سے ان کے اندر نئی زندگی دوڑ گئی ہو گی۔ آپ بھی اپنے اندر یہ نئی زندگی محسوس کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ درج بالا ہدایت نامے کے مطابق لائحہ عمل اختیار کریں۔

آخر میں ہم دوا کے ساتھ ساتھ کچھ پرہیز کے بارے میں بھی بتانا چاہتے ہیں۔ سو ان دنوں معتوب لوگوں سے پرہیز کریں۔ صورتِ حال پوری طرح واضح ہوئے بغیر اسلام اور سوشلزم کی موجودہ بحث سے پرہیز کریں۔ اور اگر اس کے باوجود خدا نخواستہ عروسِ وزارت ہاتھ نہیں لگتی تو آنکھیں دکھاتے سے کہ پیپلز پارٹی شریفوں کی جماعت ہے اور اس میں انہی لوگوں کو پسند کیا جاتا ہے جن کی نظریں جھکی ہوتی ہیں۔

۳۰ جولائی ۱۹۷۵ء

مریض اور معالج

ایک صاحب کی آنکھ پھڑکتی تھی، کان شائیں شائیں کرتے تھے اور دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا، وہ ڈاکٹر کے پاس گئے، ڈاکٹر نے نبض دیکھی اور کہا کہ آپ کے دانت خراب ہیں، جس سے معدے میں گڑبڑ ہے، لہٰذا آپ فوری طور پر تمام دانت نکلوا دیں۔ چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے تمام دانت نکلوا دیئے، لیکن اس کے باوجود ان کی آنکھ پھڑکتی رہی کان شائیں شائیں کرتے رہے۔ دم رُکتا محسوس ہوتا رہا۔ اس پر انہوں نے ایک دوسرے ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو اُس نے بتایا کہ دانت نکلوانے کے باوجود معدے میں فاسد مواد موجود ہے، جس سے بخارات دماغ کی طرف اُٹھتے ہیں اور آپ کو متذکرہ تکالیف محسوس ہوتی ہیں۔ لہٰذا فوری طور پر جلاب لیں اس سے انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے جلاب لینے شروع کر دیئے مگر اس کے باوجود کوئی فرق محسوس ہوا۔ بلکہ کمزوری اور نقاہت حد درجہ بڑھ گئی۔ اس پر وہ صاحب تیسرے ڈاکٹر کے پاس گئے، اس نے نبض دیکھی اور پھر مایوسی کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ آپ کے دن گنے جا چکے ہیں۔ چنانچہ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ زندہ رہ سکیں گے۔ یہ سن کر ان صاحب کو شدید صدمہ ہوا مگر پھر انہوں نے سوچا کہ اگر موت مقدر ہی بن چکی ہے تو پھر کیوں نہ ان چھ مہینوں میں جی بھر کر آسائش کی زندگی بسر کی جائے چنانچہ انہوں نے بازار جا کر لمبی چوڑی شاپنگ کی اور پھر اپنے درزی کے پاس قمیض کا ماپ دینے کے لئے گئے درزی نے ان کے کالر کا ماپ لیتے ہوئے شاگرد کو پندرہ انچ سائز لکھنے کے لیے کہا۔ اس پر ان صاحب نے درزی کو بتایا کہ ان کے کالر کا سائز پندرہ نہیں چودہ ہے مگر اس نے ان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے شاگرد کو ہدایت کی کہ وہ کالر کا سائز پندرہ انچ ہی لکھے۔ اس پر ان صاحب

نے کہا کہ وہ ایک عرصہ سے چودہ انچ سائز کا کالر ہی پہنتے چلے آرہے ہیں۔ لہٰذا کالر چودہ انچ ہی رہنے دیا جائے۔

یہ سن کر درزی نے فیتہ ایک طرف رکھا اور ان صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جناب اگر آپ آئندہ بھی اتنا تنگ کالر پہنتے رہے تو آپ کی آنکھ اسی طرح پھڑکتی رہے گی، کان شائیں شائیں کرتے رہیں گے اور دم رکتا محسوس ہوگا۔

دراصل ایک طویل عرصے سے ہم تمام پاکستانیوں کی بھی آنکھ پھڑکتی ہے۔ کان شائیں شائیں کرتے ہیں اور دم رکتا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن طبیب حضرات لباس کی تبدیلی کی فکر کی بجائے کبھی ہمارے دانت نکلوا دیتے ہیں کبھی جلاب لینے کا مشورہ دیتے ہیں اور کبھی یہ کہہ کر ہمارے پاؤں تلے سے زمین کھسکا دیتے ہیں کہ تم زیادہ سے زیادہ چھ مہینے تک زندہ رہ سکو گے مصنوعی مہنگائی، غنڈہ گردی، رشوت ستانی، سمگلنگ۔ فحاشی، عریانی، بے غیرتی، بے ضمیری، بے حسی اور اس نوع کے تمام مسائل اس تنگ کالر یا یوں کہہ لیں موجودہ نظام زر کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں یہ لباس اتار کر اپنے جسم کے مطابق لباس پہن لیجئے، تمام تکالیف رفع ہو جائیں گی۔ اور اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو پھر آنکھ اسی طرح پھڑکتی رہے گی۔ کان شائیں شائیں کرتے رہیں گے اور دم رکتا محسوس ہوتا رہے گا۔ جلاب لینے یا دانت نکلوانے سے یہ مسئلہ بہرحال حل نہیں ہوگا۔

۳۱ر جولائی ۷۵ء

سابق شیر

کہا جاتا ہے کہ ایک جنگل میں دو شیر نہیں رہ سکتے یہ بات درست ہے ہمارے ہاں بیسیوں شیر تھے مگر وہ رفتہ رفتہ تائب ہو رہے ہیں۔ شیر جب تائب ہو تو وہ جون بدل کر بکری بن جاتا ہے۔

۱۹ نومبر ۷۶ء

سیاسی بسیں

ماہنامہ "دھنک" میں ہمارے دوست ظفر اقبال نے مختلف سیاسی جماعتوں کو ٹرانسپورٹ کمپنیاں قرار دے کر ان کے خصائص گنوائے ہیں۔ مگر وہ ان کے ذکر میں بہت سی باتیں چھوڑ گئے ہیں۔ نیز کچھ امور وہ سرے سے زیرِ بحث ہی نہیں لائے۔ ہم درج ذیل سطور میں قومی و بین الاقوامی روٹوں پر چلنے والی سیاسی ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے علاوہ ادبی و ثقافتی روٹوں پر چلنے والی کا احوال درج کرنے چلے ہیں۔ تاہم آج کے کالم میں صرف سیاسی بسوں کا تذکرہ ہوگا۔

پیپلز ٹرانسپورٹ سروس

یہ لمیٹڈ کمپنی عوام کے حصص سے وجود میں آئی تھی مگر اب اس میں ان کے شیئرز برائے نام رہ گئے ہیں کمپنی کے اجراء سے قبل مسافروں کو بے پناہ سہولتیں فراہم کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا آرام دہ سیٹوں کا تذکرہ تھا۔ دوران سفر رس ملائی کھلانے کا وعدہ بھی شامل تھا اور مسافروں کو دوران سفر قیام کے لئے صاف ستھری رہائش گاہ کی یقین دہانی بھی کرائی گئی تھی۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا بلکہ بس کی چھتیں اتنی نیچی رکھی گئیں کہ مسافر سر اٹھا کر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے ان دعووں کی صورت حال کے پیش نظر بعض منچلوں نے ڈرائیور کی سیٹ کے سامنے یہ شعر لکھ دیا ہے۔

مرے محبوب نے وعدہ کیا ہے پانچویں دن کا
کسی سے سن لیا ہوگا کہ دنیا چار دن کی ہے

نہ صرف یہ کہ مسافروں کے ساتھ متذکرہ وعدے پورے نہیں کیے گئے۔ بلکہ جس کسی نے یہ وعدے یاد دلانے کی کوشش کی اسے کسی ایک بس کا کنڈکٹر مقرر کر دیا اور شرائط ملازمت میں معقول تنخواہ کے علاوہ کمیشن کی ترغیب بھی شامل کر دی۔ اس سے گڑبڑ کرنے والے مسافروں کا منہ تو بند ہو گیا۔ مگر بددیانت عملہ کے سبب نہ صرف یہ کہ عوام الناس کی بے چینی دور نہ ہوئی بلکہ وہ مزید بڑھ گئی ہے۔ بس کے پیچھے "ہارن دے کر پاس کریں" کی عبارت درج ہے مگر ہزار ہارن دینے کے باوجود یہ بس کسی کو رستہ نہیں دیتی۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں کو اس صورت حال کا فوری طور پر نوٹس لینا چاہیئے نہیں تو اپنے زمانے کی اس مقبول عام کمپنی کا دنوں میں دیوالیہ نکل جائے گا۔

استقلال ٹرانسپورٹ سروس

اس بس سروس کے ڈرئیور ایک سابق فوجی ہیں اور وہ گاڑی بہت ریش (RASH) چلاتے ہیں بلکہ انہوں نے تو دروازے پر یہ عبارت بھی درج کی ہوئی ہے کہ "بس میں داخل ہونے سے قبل اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں، ممکن ہے یہ سفر آپ کی زندگی کا آخری سفر ہو" چنانچہ مسافر عموماً اس بس میں سفر سے احتراز کرتے ہیں۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر اس میں سوار بھی ہو جاتا ہے تو دو گام چلنے کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور وہ ڈرائیور کی منت سماجت کر کے کہیں راستے ہی میں اتر جاتا ہے۔ ڈرائیور کو چاہیئے کہ وہ سپیڈ لمٹ کی پابندی ضرور کرے کہ اس میں مسافروں کے علاوہ خود اس کا بھی بھلا ہے۔

اسلامی ٹرانسپورٹ سروس

یہ بہت قدیم بس سروس ہے جو صرف خواص کے لئے چلائی گئی تھی۔ تاہم کئی سالہ پلان کے تحت اس میں عام مسافروں کے لیے گنجائش رکھنے کا عزم بھی شامل تھا۔ مگر تاحال عوام الناس کے لئے اس میں جگہ پیدا نہیں ہوئی۔ خود عوام بھی اس بس میں سفر سے احتراز کرتے ہیں۔ کیونکہ سفر کے دوران کسی ایسی جگہ بس کھڑی کر دی جاتی ہے۔ جہاں دور دور تک قیام و طعام کا کوئی بندوبست نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس کی پیشانی پر تو یہ مصرعہ بھی درج ہے۔

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اس بس کے باقاعدہ مسافروں میں سے بعض کو انتظامیہ سے یہ شکایت ہے کہ اس کے ڈرائیور بہت سست رفتار ہیں اور کچھ اس قدر احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ہر دور میں دوسری کمپنی کی بسیں ایک زناٹے کے ساتھ ان سے آگے نکل جاتی ہیں اور یوں جلد از جلد منزل تک پہنچنے کے خواہش مند مسافر دانت کچکچا کر رہ جاتے ہیں۔ تاہم اس بس سروس کا عملہ مختنی ہے اور خدمتِ خلق کے کاموں میں دلچسپی لیتا ہے نیز یہ کہ اپنی کمپنی کے ساتھ دیانتدار ہے۔ جس کے سبب یہ خسارے میں جانے کے باوجود کسی نہ کسی طور ابھی تک چل رہی ہے۔

لیگ ٹرانسپورٹ سروس

یہ ٹرانسپورٹ سروس ۱۹۰۶ء میں وجود میں آئی تھی اور اس نے اپنی اعلیٰ سروس کے باعث دیکھتے ہی دیکھتے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا۔ اس کمپنی کی بے پناہ خدمات ہیں۔ جنہیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا تاہم ایک طویل عرصہ سے اس کی ساکھ گرنا شروع ہو گئی ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے تجربہ کار ڈرائیور زیادہ پیسوں کی لالچ میں ایک ایک کر کے دوسری کمپنیوں میں چلے گئے ہیں اس سے قبل بد دیانت اہل کاروں نے اس بس سروس کے پرزے بیچ بیچ کر کھانا شروع کر دیئے۔ جس سے یہ بس دھکا سٹارٹ ہو کر رہ گئی ہے چنانچہ اب یہ چلتی کم اور شور زیادہ کرتی ہے نیز دھواں بھی بہت چھوڑتی ہے۔ انتظامیہ نے بس کی خستہ حالی کے مدنظر راہ گیروں کے لئے پیشانی پر یہ اپیل درج کر رکھی ہے۔ (PLEASE RETURN FALLEN PARTS)

یعنی براہ کرم گرے پڑے پرزے انتظامیہ کو واپس کر دیں!"

جمعیت ٹرانسپورٹ سروس

جمعیت ٹرانسپورٹ، کے نام سے کئی بسیں مختلف روٹوں پر چلتی ہیں۔ تاہم ان میں سے کسی کے نام کے آگے "علمائے اسلام" کا اضافہ ہے اور کسی کے ساتھ علمائے پاکستان" درج ہے اور پھر آگے ان کی کئی کئی شاخیں ہیں۔ جس سے مسافروں کو اکثر دھوکا ہوتا ہے اور پھر وہ بغیر دیکھے ان میں

سے کسی ایک بس میں سوار ہو جاتے ہیں ان مسافروں میں زیادہ تعداد زائرین کی ہوتی ہے چنانچہ اس کمپنی کی بسوں میں صرف نعتوں قوالیوں کے ریکارڈ بجائے جاتے ہیں۔ کھڑکیوں کے اوپر آیات قرآنی اور احادیث درج ہیں۔ تاہم یہ کھڑکیاں ہمیشہ بند رہتی ہیں۔ جس سے ایک تو تازہ ہوا اندر نہیں آنے پاتی اور دوسرے مسافروں کو باہر کا منظر دکھائی نہیں دیتا۔ ان بسوں کی انتظامیہ کو چاہیئے کہ وہ کھڑکیاں کھلی رکھیں کیونکہ یہ امر زائرین کی عمدہ صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔

مجیب ٹرانسپورٹ سروس

سابق مشرقی پاکستان کی یہ ٹرانسپورٹ سروس غیر ملکی سرمائے سے وجود میں آئی تھی۔ شروع شروع میں اس کمپنی نے بہت مال بنایا ایک مرحلے پر مسافروں کو یہ خبر سنائی گئی کہ ایک تفریحی بس کے ذریعے انہیں "سونار بنگلہ دیش" کے دلفریب نظارے دکھائے جائیں گے۔ اس پر کئی بھولے بھالے مسافر اس میں سوار ہو گئے مگر ڈرائیور نے بس کو ایک گہرے کھڈ میں دھکیل دیا اور خود کھڑکی سے کود کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا اس سانحہ کے بعد جن مسافروں کے ہوش برقرار رہے انہوں نے ایک روز موقع پا کر جوش انتقام میں کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر حتیٰ کہ اس کے افراد خانہ تک کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب حال ہی میں انتظامیہ میں بڑے وسیع پیمانے پر ردوبدل ہوا ہے، جس سے صورت حال کے بہتر ہونے کی خاصی توقع ہے تاہم ابھی تک مسافروں کے لئے ڈرائیور کی سیٹ پر یہ ہدایت درج ہے کہ "اپنے سامان کی خود حفاظت کریں۔!"

اندرا ٹرانسپورٹ سروس

یہ توسیع پسند استحصالی کمپنی بیک وقت مختلف روٹوں پر چلتی ہے۔ مگر اس کی سب سے بڑی خواہش، پاکستان کے روٹ کا حصول ہے تاکہ وہ اس علاقے میں بھی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر سکے۔ وطن عزیز کے ایک حصے میں اس کی تجارتی چالیں وقتی طور پر کامیاب بھی ہوئی ہیں تاہم اس کے ساتھ ہی اس بس سروس کا اپنا زوال شروع ہو گیا ایک طرف تو بنگلہ دیش کے عوام نے اس کی لوٹ کھسوٹ سے تنگ آ کر اس پر پتھراؤ شروع کر دیا جس سے اس کی کھڑکیاں شیشے ٹوٹ

گئے اور دوسری طرف خود اس کے اپنے علاقے کے مسافروں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ جس کے باعث اس بس سروس کے انجر پنجر ہل گئے ہیں۔ اور اب یہ کمپنی اپنے منطقی انجام کو پہنچنے ہی والی ہے۔ بس کی پیشانی پر یہ مصرعہ جلی قلم کے ساتھ درج ہے۔

ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔!

۲۸ر اگست ۷۵ء

نوشتۂ دیوار

دیواروں پر سب سے زیادہ جو خوشخبری سنائی جاتی ہے۔ وہ بانجھ مریضوں کے لئے ہے اور ان "ڈاکٹروں" کی طرف سے ہے جن میں سے کوئی امریکہ، کوئی یورپ اور کوئی مشرقِ وسطےٰ میں اپنے فن کا لوہا منوا کر وطن واپس پہنچا ہے اور یا کسی ایسے سنیاسی بابا کی طرف سے ہے جو اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں پہاڑوں سے اتر کر ان بستیوں میں چلا آیا ہے۔ قوم کی کمزوری ظاہر کرنے والے یہ اشتہار دیواروں پر اس کثرت سے نظر آتے ہیں کہ اس کے بعد قوم کے لئے فیملی پلاننگ کے محکمے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

۲۶ر جنوری ۱۹۷۷ء

کانا عاشق

گذشتہ روز ہماری ملاقات ایک عاشق زار سے ہوئی جو بیک وقت دو محبوبوں کا ذکر کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا۔ اور ساتھ ساتھ جیب سے کنگھی نکال کر بال سنوارتا جاتا تھا۔ ان ہر دو محبوبوں کا ذکر کرتے ہوئے اس پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور پھر وہ BRUT میں ڈوبے ہوئے رومال سے آنکھوں کو تھپتھپانے کے بعد ٹائی کی ناٹ درست کرنے لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں تھیں اور جوتے آئینے کی طرح صاف شفاف تھے۔ ہم نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو کہا "اے برادر! اگر تیرا عشق صادق ہے تو پھر تیرا حال عاشقوں جیسا کیوں نہیں؟" اس نے رومال سے پسینہ پونچھنے کے بعد بغلوں میں DEODRANT سپرے کرتے ہوئے پوچھا "کیا مطلب؟" ہم نے کہا "یہی کہ کسی ایک سے دل لگا۔ اس کے بعد شیو بڑھا۔ گریبان چاک کر اور سر پہ خاک ڈال کر جنگلوں کی طرف نکل جا۔" یہ سن کر اس نے ہماری طرف دیکھا اور کہا۔ "اے برادرِ یوسف! تو صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ میں تیرے حق میں ان سے دستبردار ہو جاؤں؟"

ہم نے اس شکی مزاج عاشق کو تاسف کی نظروں سے دیکھا اور اسے ملامت کرتے ہوئے پوچھا کہ اس کے ذہن میں ایسی گھٹیا بات کیونکر آئی اور پھر اس نے اس قدر بدگمانی سے کیونکر کام لیا کہ اگر وہ ایسا کر گزرے تو ہم نیکی کا بدلہ نیکی سے ادا نہیں کریں گے؟ جس پر یہ شخص مذکور ہنسا۔ وان ہاؤزن شرٹ کے کالر پر سے گرد جھاڑی اور بولا "نہ میں نے کوئی گھٹیا بات کہی ہے اور نہ کسی بدگمانی سے کام لیا ہے اگر میں تمہارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے شیو بڑھا لوں۔ گریبان چاک کر بیٹھوں۔ اور جنگلوں کی طرف نکل جاؤں تو ہفتے عشرے بعد تم ہر دو کے بارے میں اخباروں میں یہ خبر پڑھو گے کہ "بے وفا محبوبہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی

اور عاشق غل غپاڑہ کرتے ہوئے پکڑا گیا۔" جب ہم نے اس دیوانے کے منہ سے یہ فرزانوں والی بات سُنی تو جھک کر اس کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا "مرشد! دنیا بھر کے عاشقوں کے لیے کوئی پیغام دیتے جاؤ"۔ اس پر اس نے ہمیں شفقت سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا "عاشقوں کے لیے میرا پیغام یہی ہے کہ وہ دورانِ محبت صرف ایک آنکھ بند رکھیں اور دوسری بہر صورت کھلی رہنے دیں۔ نیز وہ ایک متبادل محبوب کا بندوبست بھی ضرور کریں جس نے دونوں آنکھیں بند کیں یا کسی ایک کا ہو کر رہ گیا۔ وہ ہمیشہ خون کے آنسو رویا۔" اسکے ساتھ ہی اس نے اپنی سپورٹس ماڈل کار سٹارٹ کی اور پھر فُل ایکسیلیٹر دیتے ہوئے ایک کوچۂ جاناں کو مڑ لیا۔

اس ہوشمند عاشق کے جانے کے بعد ہم نے اس کی باتوں پر غور کیا تو ان کی صداقت کچھ اور واضح ہوئی۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے اردگرد جتنے کامیاب عاشق ہیں یہ وہی ہیں جنہوں نے اپنی ایک آنکھ کھلی رکھی ہوئی ہے اور ایک متبادل محبوب کا بندوبست بھی کیا ہوا ہے۔ مثلاً ہمارے ایک دوست ہیں جو انقلاب کے عشق میں ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ پتہ بھی کھڑکتا ہے تو ان کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ جاتی ہیں کہ شاید "وہ" آگئے ہیں۔ مگر انہوں نے اس عشق میں اپنی دونوں آنکھیں بند نہیں ہونے دیں بلکہ ایک کھلی رکھی ہے۔ جو ہر وقت ریڈیو، ٹی وی پروگراموں پر لگی رہتی ہے۔ ایک مولانا سے ہماری یاد اللہ ہے۔ وِیندار بھی ان کے پاؤں چومتے ہیں اور ہم ایسے دنیا کے کتے بھی ان کے در پر جانے کے لئے مجبور ہیں کیونکہ ان کی خدا اور خداوند دونوں تک رسائی ہے۔ ایک ایسے مخیّر سرمایہ دار کو بھی ہم جانتے ہیں جس کا ایک ہاتھ ہمہ وقت سخاوت کرنے اور دوسرا ہاتھ ہمہ وقت یہ سخاوت واپس لینے میں لگا رہتا ہے۔ ایک ایسا حُرّیت پسند ہماری نظروں میں ہے جو گفتگو حکومت وقت کے خلاف کرتا اور لکھتا اس کے حق میں ہے۔ ایک بزرگ شاعر کو ہم نے یہ کہتے سنا ہے کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں انہوں نے جو ترانے لکھے وہ اس نوع کے تھے کہ پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بھی مقبول ہوئے۔ حزبِ اختلاف سے متعلق بعض لوگ حزبِ اقتدار کے دلوں اور ہڈیوں میں بھی جگہ اور حصہ رکھتے ہیں۔ اور پھر ان کے علاوہ ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے کامیاب عاشقوں میں وکیلوں کا گروہ شامل ہے جو قاتل اور مقتول دونوں کا مقدمہ بڑی کامیابی سے لڑتا ہے۔ استاد ہیں جو فرعون پر لعنت بھیجتے ہیں اور کالجوں میں موسیٰؑ کی پیدائش روکنے کا فریضہ بھی پوری دیانتداری سے انجام دیتے ہیں۔ کچھ علماء ہیں جو حسینؓ کا اسوہ بیان کرتے ہیں اور ہر دور میں یزید کی صفوں میں بھی نظر آتے ہیں بعض لیبر لیڈر ہیں جو لیبر افسر کے طور پر بھی کام کرتے ہیں اور کچھ صحافی ہیں جو اپنے اخبار اور اپنے "محکمے"

کے لیے بیک وقت "رپورٹنگ" کرتے ہیں۔

ان سب عاشقوں نے متبادل محبوب کا انتظام کیا ہوا ہے یہ ایک آنکھ کھلی رکھنے والے عاشق ہیں ــــ ہرکانے عاشق ہیں ــــ!

۱۱ ستمبر ۱۹۷۵ء

ــــــــ کلنک کا ٹیکہ

ان دو محاوروں کا جملوں میں استعمال ایک طرف اور ایک عزیز طالبہ نے جس طرح ایک محاورے کو جملے میں استعمال کیا ہے وہ اگر دوسری طرف رکھ دیں تو بھی پلڑا اِدھر ہی کا بھاری رہتا ہے اس عزیز طالبہ نے "کلنک کا ٹیکہ" کو جملے میں استعمال کرتے ہوئے لکھا "ہمارے محلے میں تمام لوگوں نے کلنک کے ٹیکے لگوائے لیکن میں اس روز گھر پر نہ تھی، اس لیے کلنک کا ٹیکہ نہ لگوا سکی۔" ہم آج تک اس محاورے کی صرف ظاہری سطح ہی دیکھتے رہے۔ اس کی دیگر پرتوں پر ہماری نظر ہی نہ جا سکی اب یہ عقدہ ہم پہ کھلا ہے۔ تو برادرانِ وطن سے التماس ہے کہ یوں تو قومی سطح پر ہم سب کلنک کا ٹیکہ لگوا چکے ہیں لیکن اگر کوئی بچ گیا ہو تو وہ اولین فرصت میں کلنک کا ٹیکہ لگوائے کہ اقبالؒ کا سال ہے اور اقبالؒ نے کہا ہے ؎

فرد قائم "ربطِ ملت" سے ہے تنہا کچھ نہیں!

۱۴ نومبر ۱۹۷۷ء

الفلاح بلڈنگ

کہا جاتا ہے کہ سائنسی دور میں دنیا سمٹ کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ مثلاً کسی زمانے میں چیرنگ کراس سے مزنگ چونگی کا فاصلہ ایک آدھ میل ہوا کرتا تھا۔ اب تین میل کے قریب ہے۔ مزنگ چونگی سے ماڈل ٹاؤن قریباً پانچ میل تھا۔ اب کم از کم آٹھ نو میل ہے اس میں زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ چیرنگ کراس وغیرہ اب بھی وہیں واقع ہیں جہاں پہلے ہوا کرتے تھے اور مزنگ چونگی وغیرہ کا محلِ وقوع بھی تبدیل نہیں ہوا۔ اگر کہیں تھوڑی بہت تبدیلی ہوئی ہے تو وہ رکشاؤں اور ٹیکسیوں کے میٹروں میں ہوئی ہے جس سے ان جگہوں کے فاصلے خود بخود بڑھ گئے ہیں لہٰذا اب اگر آپ نے دو تین میل کا سفر طے کرنا ہو تو یہ خود بخود چار پانچ میلوں پر محیط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شام کو دو چار ضروری کام سرانجام دے کر جب آپ گھر لوٹتے ہیں تو خالی جیب کو ٹٹولتے ہوئے اہالیانِ خانہ کو بتاتے ہیں کہ آج آپ ڈیڑھ دو سو میل سفر طے کر کے آئے ہیں۔ تاہم ہمارے نزدیک یہ بھی سائنس کی "برکات" میں سے ایک ہے کیونکہ اب جو شخص ایک ماہ تک ریگل سے سمن آباد اور سمن آباد سے ریگل تک کا فاصلہ رکشہ یا ٹیکسی میں طے کرتا ہے تو جان لیں کہ وہ نادان ہے جو ان کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ میٹر کے حساب سے جتنے فاصلے کا بل اس نے ادا کیا، اس سے کم پیسوں میں وہ یورپ کی سیاحت سے لوٹ سکتا تھا تاہم سیاح کہلانے کا حق پھر بھی اس کے پاس محفوظ ہے۔ وہ جب چاہے اپنے سیاح ہونے کا اعلان کر سکتا ہے اور اس کے بعد جی بھر کر جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

فاصلوں میں یہ تبدیلی صرف مقامات ہی کے ضمن میں واقع نہیں ہوئی اور یہ تیز رفتار میٹر صرف

رکشوں اور ٹیکسیوں ہی میں فٹ نہیں ہیں بلکہ ہم لوگوں نے باہمی روابط اور تعلقات کے ضمن میں بھی تیز رفتار میٹر چلائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ بظاہر لگتا ہے کہ ہم ایک طویل مسافت طے کرکے ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے ہیں لیکن حقیقتاً ہم نے نہایت معمولی فاصلہ طے کیا ہوتا ہے ہمارے ہاں بیشتر صورتوں میں یہ تیز رفتار میٹر میاں بیوی کے تعلقات کے ضمن میں استعمال ہوتا ہے اور اس کے خوشگوار نتائج نکلنے کی بجائے ایک وقت وہ آتا ہے جب وہ مخالف سمتوں میں چلنے کے باعث ایک دوسرے سے اتنے دور نکل جاتے ہیں کہ واپسی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اسی طرح حکومتی کارناموں کی تشہیر کرنیوالے ادارے بھی یہ میٹر استعمال کرتے ہیں چنانچہ ان کی میل ظاہر کرنے والی سوئی سے یہ اندازہ ہوتا ہے گویا ملک ترقی کی بے شمار منزلیں طے کر چکا ہے بلکہ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا امریکہ، روس اور چین جیسے ملک بھی ہمارے دست نگر بن کر رہ گئے ہیں لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو ہم وہیں کھڑے نظر آتے ہیں جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔ حالانکہ قوم نے اس طویل مسافت کے لئے میٹر کے حساب ہی سے کرایہ ادا کیا تھا ایک مدہوش شرابی نے الفلاح بلڈنگ کے سامنے ٹیکسی روکی اور پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا "الفلاح بلڈنگ چلو"۔ ڈرائیور یہ سن کر مسکرایا۔ اس نے اتر کر ٹیکسی کا دوسرا دروازہ کھولا اور مدہوش شرابی سے کہا "صاحب الفلاح بلڈنگ آگئی ہے"۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے دوسرے دروازے سے اترا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی ہتھیلی پر پیسے رکھے اور کہا :۔

"اتنی تیز نہ چلایا کرو حادثے کا خدشہ ہوتا ہے"۔

پراپیگنڈے کے نشے میں بے حال ہم مسافروں کے ساتھ ٹیکسی ڈرائیور یہی سلوک کرتے آئے ہیں یہ تیز رفتار میٹر ٹیکسی رکشوں، ازدواجی اداروں اور حکومتی تشہیر کے شعبوں ہی میں فٹ نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی کو بھی کنٹرول کرتے نظر آتے ہیں مثلاً کروڑوں روپے کی غیر ملکی امداد انہی تیز رفتار میٹروں کے طفیل برق رفتاری سے ان خانوں میں چلی جاتی ہے جہاں اسے جانا چاہیئے۔ لیکن ایک عرصہ بعد ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ تو تیز رفتار میٹر کا کمال تھا جس کی بدولت یہ امداد اپنی منزل تک پہنچی محسوس ہوئی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ آنے جانے کے کرایوں ہی میں خرد برد ہو کر رہ گئی ہے اسی طرح بڑے بڑے تعمیراتی

کاموں کے ٹھیکیدار، بلوں کو منظور کرنے والا افسر، فائل آگے چلانے والا کلرک، گراں فروشی تاجر، سبھی تیز رفتار میٹر استعمال کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور سبھی اپنی اپنی جگہ بڑبڑاتے ہیں کہ کرپشن بہت بڑھ گئی ہیں۔ فاصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ یہ فاصلے کم ہو سکتے ہیں اگر میٹروں پر نظر رکھنے والا نظام نافذ کر دیا جائے۔ تاہم اس سے قبل ضروری ہے کہ ہم انفرادی طور پر اپنے اپنے میٹر خود ہی درست کر لیں ورنہ ہر دور میں یہی ہوگا کہ ڈرائیور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر کہے گا۔

"صاحب" الفلاح "بلڈنگ آ گئی ہے"۔

۱۴ ستمبر ۷۵ء

ـــــــــــ ہیروئن کی ماں

ہم ہیروئن کی ماں اور اس کی کھانسی سے سخت بےزار ہو گئے ہیں یہ ہیروئن وہی فلموں والی ہیروئن ہے جو خود تو ہیرو کے ساتھ لڈیاں ڈالتی ہے اور ہمارے لئے گھر میں اپنی ماں اور اس کی کھانسی چھوڑ جاتی ہے۔ ہر دوسرے چوتھے منظر میں یہ ماں کیمرے کے سامنے آجاتی ہے اور کھانس کھانس کر اپنا اور ناظرین کا بُرا حال کردیتی ہے۔ یہ مناظر سگریٹ نوشی کے نقصان دکھانے کے لئے پیش نہیں کئے جاتے کیونکہ ہیروئن کی ماں سگریٹ نہیں پیتی، ہیروئن پیتی ہے اور اسے کھانستے ہوئے نہیں دکھایا جا سکتا۔

۲۷ نومبر ۱۹۷۶ء

سلیپنگ سُوٹ

نظر بند یحییٰ خان سے دو بدو ملاقات کا "شرف" تو حاصل نہیں ہوا۔ البتہ ان سے "ہیلو ہیلو" ہوئی اور کچھ "مذاکرات" بچوں کی وساطت سے ہوئے ہیں۔ یحییٰ خاں ۱۶ ہارلے سٹریٹ میں "نظر بند" ہیں اور روزانہ شام کو چار بج کر بیس منٹ پر اپنے بنگلے کی دوسری منزل کے "کوٹھے" پر نمودار ہوتے ہیں اور پھر کرسی پر براجمان سیاہ شیشوں کی عینک پہنے ریلنگ پر کہنیاں رکھے سڑک پر سے گزرتے ہوئے خواتین وحضرات (حضرات کو کم خواتین کو زیادہ) ویو (WAVE) کرتے اور لبا اوقات "ویو" وصول کرتے ہیں۔ تاہم ان کا زیادہ وقت ریلنگ پر کہنیاں جمائے مسلسل خلا میں گھورتے گزر جاتا ہے۔ ٹھیک وقت پر ہم بھی اپنے میزبان کی اقامت گاہ سے نکلے اور یحییٰ خاں کو اسی عالم میں پایا جسکا ذکر ابھی ہم نے کیا ہے۔ سڑک سے چند گز کے فاصلے پر بنگلے کی چار دیواری کے اندر وہ عمارت تھی اور اس عمارت کی دوسری منزل پر یحییٰ خاں سیاہ شیشوں کی عینک پہنے ایک ہی سمت گھورتے جا رہے تھے۔ انہوں نے نیلے رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی اور نچلا دھڑ ریلنگ کے پیچھے ہونے کی وجہ سے نظروں سے اوجھل تھا۔ ہم نے اپنے ہمرکاب بچوں کو اکسانے کے لیے ان سے شرط باندھی کہ یحییٰ خاں نے شلوار قمیص پہنی ہوئی ہے جب کہ بچے اس پر بضد تھے کہ یحییٰ خاں شلوار قمیص میں نہیں بلکہ سلیپنگ سوٹ میں ملبوس ہے۔ اس پر ہم نے کہا کہ جھگڑے کی کونسی بات ہے، آواز دے کر پوچھ لو کہ اس نے کیا پہنا ہوا ہے۔ چنانچہ بچے سڑک کے اس حصے میں پہنچ گئے جس کے عین سامنے اپنے مکان کی دوسری منزل پر یحییٰ خاں کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک نے اتنی زور سے یحییٰ خاں کو "سر" کہہ کر پکارا کہ آواز ان تک پہنچ گئی اور وہ خیالات کا تانا بانا توڑ کر

ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"سر! انکل نے ہمارے ساتھ شرط باندھی ہے کہ آپ نے شلوار قمیض پہنی ہے جب کہ ہم کہہ رہے ہیں کہ آپ نے سلیپنگ سوٹ پہنا ہوا ہے اب فیصلہ آپ نے کرنا ہے"۔

ایک بچے نے جرات کر کے ان کو مخاطب کیا، یہ سن کر یحییٰ خان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ اس کے ساتھ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے:۔

"بیٹے! تمہارے انکل شرط ہار گئے ہیں اور تم جیت گئے ہو، دیکھو میں نے سلیپنگ سوٹ پہنا ہوا ہے"۔

انہوں نے بار کی دوسری طرف سے بآواز بلند کہا۔ یہ سن کر بچے خوش خوش واپس آئے کہ انہوں نے شرط جیت لی تھی۔ ہم نے انہیں بہر حال یہ نہیں بتایا کہ پاکستان کی تباہی میں یحییٰ خاں کے اس "سلیپنگ سوٹ" کا کتنا حصہ ہے؟

۱۲ر نومبر ۷۵ء

اصول

ہمارے ایک دوست کا یہ اصول ہے کہ انسان زندگی میں انتہائی بے اصول ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ کسی اصول کو نہیں مانتے اور مکمل طور پر بے اصولی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ دوستوں نے انہیں متعدد بار کہا ہے کہ وہ اپنے اس اصول سے کنارہ کش ہو جائیں مگر وہ سختی سے اس مشورہ کو رد کر دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اصولوں پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

۱۹ر مئی ۱۹۷۷ء

شیر دا بچہ

رات کے ایک بجے جب میں گجرات سے لاہور آنے کے لیے ویگن "شیر دی بچی" پر سوار ہوا تو مجھے ڈرائیور کے برابر میں سیٹ ملی جو پنڈی سے آنے والے ایک مسافر نے ابھی ابھی خالی کی تھی، میرے ساتھ ایک پچیس چھبیس سالہ نوجوان جس کے چہرے پر باریک مونچھیں تھیں، سیٹ کے ساتھ ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ اس نے کانوں کے گرد مفلر لپٹا ہوا تھا اور تھوڑی دیر بعد کونوں کھدروں سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے باعث وہ اپنی ٹانگیں سکیڑ لیتا تھا اور مفلر کو زیادہ مضبوطی سے کانوں کے گرد لپیٹنے لگتا تھا۔ میری پچھلی سیٹ پر ایک امریکی جوڑا براجمان تھا۔ نوجوان کے چہرے پر گھنی "بلانڈ" داڑھی تھی لیکن اس قدر باریش ہونے کے باوجود وہ کم سن لگتا تھا۔ اس کی "سفری گرل فرینڈ" کم سن ہی نہیں خاصی تر و تازہ بھی تھی۔ اسے غالباً زکام ہو رہا تھا کیونکہ اس کی ستواں ناک سُرخ نظر آ رہی تھی۔ اس کے برابر میں تیسرا مسافر اپنا ہم وطن ہی تھا اور اس میں ہم وطنوں کی خصوصیات کچھ زیادہ ہی نمایاں تھیں کیونکہ وہ تھوڑی دیر بعد اونگھنے کے بہانے اپنا سرسوں کے تیل سے لتھڑا ہوا سر اس امریکی دوشیزہ کے کاندھوں پر رکھ دیتا جس پر وہ جھنجلا کر اپنے بوائے فرینڈ کو دیکھنے لگتی۔

میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ابھی سگریٹ سلگانے ہی کو تھا کہ پچھلی سیٹ پر سے امریکی نوجوان نے "ایکسیوز می" کہہ کر میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھا۔ میں نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا تو وہ سگریٹ کا طلب گار تھا کیونکہ اس کے بقول ڈرائیور نے راولپنڈی سے روانگی کے بعد ویگن کو کہیں بریک نہ لگائی تھی اور گجرات میں بھی اس نے ویگن وہاں کھڑی کی جہاں سگریٹوں کی کوئی

دکان نہ تھی، میں نے ایک سگریٹ اسے پیش کرنے کے بعد پیکٹ میں سے جھانکتا ہوا ایک سگریٹ اس کی گرل فرینڈ کی طرف بھی بڑھایا مگر اس نے شکریے کے ساتھ یہ کہہ کر انکار میں سر ہلایا کہ وہ سگریٹ نہیں پیتی۔
اس پر میں نے ایسے موقعوں کے لئے امریکہ میں سیکھے ہوئے "ٹوٹکوں" میں سے ایک بروئے کار لاتے ہوئے کہا:۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم چھوٹے موٹے گناہوں میں یقین نہیں رکھتیں" جس پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ہم آج ہی کابل کے رستے پشاور پہنچے ہیں اور اب پنڈی سے لاہور جا رہے ہیں۔ ہم کتنے بجے تک لاہور پہنچ جائیں گے؟" سنہری داڑھی والے امریکی نے غالباً گفتگو کا آغاز کرنے کے لیے مجھ سے پوچھا
"اس امر کا امکان موجود ہے کہ ہم تین بجے لاہور میں ہوں گے اور اس امر کا قوی امکان بھی موجود ہے کہ ہم کبھی لاہور نہیں پہنچ سکیں گے!"
میں نے ڈرائیور کی تیز رفتاری اور ہر آدھ منٹ بعد سامنے سے ٹیڑھی گردنوں اور ایک آنکھ والے ٹرکوں کی آمد و رفت مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر دو امکانات پوری دیانت داری سے اس کے سامنے پیش کر دیئے۔
"اوہ خدایا!" اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی پُسی کیٹ (PUSSY CAT) نے سسکاری لی "میں نے تو ابھی انڈیا میں جوگیوں سے ملاقات کرنا ہے۔ مہارشی گورو جے کے چرنوں کو چھونا ہے جو آج کل وہیں ہیں نیپال بھی جانا ہے۔ تمہیں منہ سے ایسی بات نہیں نکالنا چاہیئے تھی۔"
"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں تم یہی سمجھو کہ ہم واقعی لاہور پہنچ جائیں گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر میں لاہور ہی میں تمہاری ملاقات بڑے بڑے مہارشیوں سے کرا دوں تو تم اپنا سفرِ بھارت ملتوی کر دو گی؟"

"سچ مچ؟" اس نے تحیّر کے عالم میں آگے کو جھک کر پوچھا!
"ہاں! ہمارے ہاں بھی اس نوع کا ایک سے ایک "گرو" پڑا ہوا ہے۔ لیکن حکومت ان کی روحانی سرگرمیوں میں رکاوٹ بنتی ہے چنانچہ پچھلے دنوں حکومت نے اس نوع کے ایک بہت بڑے "گرو" "حضرت ڈبہ پیر" کو گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا!"
"کریزی پیپل" (CRAZY PEOPLE) دوشیزہ کے چہرے پر بیزاری کے آثار نمایاں ہوئے

" چھوڑو اس ذکر کو تم یہ بتاؤ کہ تمہیں پاکستان کیسا لگا؟ میں نے پوچھا۔

" یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں " امریکی نوجوان نے اس کی طرف سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں ایک بار پہلے بھی یہاں آچکا ہوں۔ چنانچہ اس دوران میں جہاں کہیں بھی گیا۔ لوگوں نے خوش آمدید کہا۔ ان سے صرف راستہ پوچھو تو وہ گھر تک چھوڑ کر آتے ہیں۔ مہمان نواز بھی بہت ہیں۔ بس اتنا ہے کہ ہمیں وہ کچھ اتنے غور سے دیکھتے ہیں اور ہمارے گرد کچھ اس طرح جمع ہو جاتے ہیں گویا ہم کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہیں۔ بڑے شہروں میں نسبتاً یہ کم ہوتا ہے لیکن چھوٹے شہروں میں تو ہماری کم بختی آجاتی ہے۔ ویسے ہمیں اس مسئلے سے ایران، ترکی، افغانستان اور بھارت ہر جگہ دو چار ہونا پڑتا ہے۔ کیا ہماری شکل بندروں سے ملتی جلتی ہے۔؟"

آخری فقرہ کہتے ہوئے اس نے قہقہہ لگایا جس پر میں نے اس کے کاندھے تھپتھپاتے ہوئے کہا "اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں کیونکہ " آباؤ اجداد" کے ساتھ اگر نقوش نہ ملتے ہوں تو لوگ اس سے زیادہ بری باتیں کرتے ہیں۔"

یہ سن کر سنہری داڑھی والے امریکی نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا جس میں اس کی ریشمی گرل فرینڈ کی مترنم ہنسی بھی شامل تھی۔

" کیا تم طالب علم ہو یا کہیں کام کر رہے ہو۔؟" میں نے گفتگو کا یہ سلسلہ جاری رکھنے کے لئے امریکی نوجوان سے پوچھا۔

میرے پاس نفسیات میں ماسٹر کی ڈگری ہے اور میں ...."

" تب تو مجھے تم سے ڈرنا چاہیئے" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

تمہیں مجھ سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے، میں تو خود سے خوفزدہ ہوں"۔ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

پیشتر اس کے کہ میں جواب میں کچھ کہتا۔ اس کی گرل فرینڈ نے اپنی سیٹ سے قدرے اچھلتے ہوئے ہلکی سی چیخ ماری اور پھر قہر آلود نظروں سے میرے ہم وطن کو دیکھنے لگی۔ جس کے چہرے پر اب قدرے گھبراہٹ کے آثار تھے مگر اس "شیر کے بچے" نے یوں آنکھیں بند کر لی تھیں۔ جیسے

وہ کچھ نہ جانتا ہو۔ امریکی دوشیزہ اپنی سیٹ سے اٹھی اور اس نے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ سیٹ تبدیل کرلی۔ ویگن راوی کے پل پر سے گزر رہی تھی اور میری پیشانی پر پنجاب کے سارے دریاؤں کا پانی عرق ندامت کی صورت میں جمع ہو گیا تھا! میں دو گھنٹے سے گردن موڑے ان سے باتیں کر رہا تھا مجھے یکایک شدید تھکن کا احساس ہوا اور میں ان سے نظریں چرا کر اپنی سیٹ پر سیدھا بیٹھ گیا۔

۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء

بڑھک

اخبارات میں بیان چھپوانے کے لیے اب لیڈر ہونا بھی شرط نہیں! صرف ایک سادہ کاغذ پر چند "بڑکیں" لکھ دینا ہی کافی ہے اس کی ایک مثال (دروغ برگردن راوی) انجمن خشت سازاں پکی ٹھٹھی کے صدر کی ہے جنہوں نے ایک اخباری بیان میں بھارت کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے ورنہ انجمن خشت سازاں پکی ٹھٹھی کے ارکان اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے امید واثق ہے کہ اس بیان سے بھارت کے حکومتی ایوانوں میں زلزلہ آ جائے گا لیکن اس سے قبل انہوں نے اینٹوں کے نرخ اتنے چڑھا دیئے ہیں کہ مکان بنانے کے خواہشمند ان کے اپنے ہموطنوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ہے۔

۲۵ جنوری ۱۹۷۵ء

دُنیا کُتّی ہے!

ہمارے ایک عالم دین دوست راوی ہیں کہ محکمہ اوقاف کے ایک ممتاز عالم دین چندروز پیشتر کسی بڑے سرکاری افسر سے ملاقات کے لیے اس کے دفتر گئے افسر مذکور حسب روایت "میٹنگ" میں مشغول تھے چنانچہ یہ کافی دیر تک باہر بنچ پر بیٹھے رہے۔ اس انتظار کے عالم میں متذکرہ عالم دین سخت پیچ وتاب کھاتے رہے بالآخر انہوں نے اپنے ساتھی سے کہا "آئندہ میں اگر کسی سرکاری افسر کے آستانے پر جاؤں تو خدا مجھ سے اپنی رحمتوں کو دور کر دے ہم لوگ دینی پیشوا ہیں اور ہمیں اپنے منصب کا لحاظ کرنا چاہیئے ہمارے اکابر کبھی ان لوگوں کے پاس نہیں گئے بلکہ ہمیشہ حکام ان کے در پر جبین نیاز جھکاتے رہے بڑے بڑے شہر یار گھنٹوں ان کے انتظار میں دروازے پر پڑے رہتے تھے لیکن وہ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے ایک ہم ہیں کہ ان افسروں کے پاس خود چل کر آتے ہیں اور وہ ہم سے ہتک آمیز سلوک کرتے ہیں یہ دنیا کُتّی ہے اس کے لیے خود کو یوں گرانا نہیں چاہیئے آئندہ میں کبھی کسی افسر کے در پر نہیں جاؤں گا" اتنی دیر میں افسر مذکور نے "میٹنگ" سے فارغ ہو کر انہیں اندر طلب کر لیا۔ چند منٹوں بعد یہ باہر نکلے تو اسی طرح خود پر لعنت بھیج رہے ہیں اور کہہ رہے تھے "ہم لوگ ننگِ اسلاف ہیں یہ دنیا کُتّی ہے اور ہم اس کے لیے ذلیل ہو رہے ہیں۔ میں ان دنوں وزیر اعظم سے ملاقات کروں گا اور گزارش کرونگا کہ وہ مجھے کہیں چار پانچ مربع اراضی الاٹ کر دیں جہاں بیٹھ کر میں اللہ اللہ کرتا رہوں۔ یہ دنیا کُتّی ہے!"

وزیراعظم سے اس قسم کی درخواست کے خواہشمند صرف علماء کے طبقے ہی میں نہیں پائے جاتے بلکہ دوسرے طبقوں میں بھی اسطرح کے "اللہ لوک" موجود ہیں ان میں سے کچھ کی یہ خواہش تو پوری ہو چکی ہے اور باقی اس کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے میں لگے ہوئے ہیں چنانچہ میاں ممتاز دولتانہ کے بارے میں شنید ہے کہ وہ ایک مرحلہ پر آج کی گتی سیاست سے بیزار ہو گئے تھے جس پر وزیراعظم بھٹو نے انہیں لندن میں سفیر مقرر کر دیا۔ تاکہ وہ باقی زندگی یاد الٰہی میں بسر کریں۔ سردار شوکت حیات نے بھی دنیاوی جھنجھٹوں سے منہ موڑا اور سینما اور مارکیٹ وغیرہ تعمیر کر کے بیٹھ گئے خان عبدالقیوم خان نے وزارت داخلہ کا منصب سنبھال لیا اور مکروہات دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔ شیخ رشید نے وزارت حاصل کی اور دنیا کے جھمیلوں سے نکل کر بتوں سے لَو لگائی تاکہ انکے ذریعے خدا تک پہنچیں۔ حنیف رامے وزیراعلیٰ بنے اور اتنا عرصہ "مکروہات دنیا" سے الگ تھلگ رہے اس سے علیحدہ ہوئے تو دوبارہ ان میں الجھ کر رہ گئے۔ ذرا نیچے آئیں تو ان "اللہ لوکوں" میں پیر علی محمد راشدی نظر آتے ہیں جنہوں نے سندھ کی سیاست کو خیر باد کہا اور اسلام آباد چلے آئے شیخ ایاز "سندھو دیش" کا نعرہ لگاتے لگاتے وائس چانسلر بن گئے تاکہ راجہ داہر کے نام کی مالا زیادہ سکون سے جپ سکیں فیض احمد فیضؔ نے ثقافتی امور کی آڑھت حاصل کی اور بقیہ زندگی "کوٹھے یار" میں بسر کر دی۔ اس کے علاوہ بھی کچھ سرکاری درویش ہیں جن کا کہنا ہے دنیا گتی ہے اس سے لو نہیں لگانی چاہیئے یہ سب لوگ وزیراعظم سے ملاقات کے خواہشمند ہیں تاکہ وہ مزید سکون سے بیٹھ کر یاد الٰہی و یاد ظل الٰہی میں مصروف ہو سکیں کہ یہ دنیا گتی ہے!

۲۲ جنوری ۷۶ء

جینٹری اور شدید پستول

ہم لوگ بہت "کلچرڈ" ہو گئے ہیں۔ چائے پیتے ہوئے ہلکی سی آواز بھی نہیں پیدا ہونے دیتے خواہ لب ہی کیوں نہ جل جائیں۔ کسی اعلیٰ درجے کے ریستوران میں بیٹھے ہوئے کچھ اسطرح سرگوشیوں میں گفتگو کرتے ہیں جیسے سازش کر رہے ہوں۔ بات بات پر "ایکسکیوز می" کہتے ہیں کھانے کے بعد خلال کرنے کے لیے ایک ہاتھ سے منہ ڈھانپ کر دوسرے ہاتھ سے خلال کرتے ہیں کہ کہیں نامناسب طریقے پر دانتوں کی نمائش نہ ہو جائے۔ کسی محفل میں کوئی اچھا سا لطیفہ سن کر ہنسنے کی نوبت آجائے تو "گیئر" بدل بدل کر ہنستے ہیں کہ کہیں بھرپور قہقہہ ہمارے مہذب ہونے کا بھرم نہ کھول دے۔ تصویروں کی نمائش میں جانا پڑتا ہے اور سمجھ میں نہ آنے والی آڑی ترچھی لکیروں کی داد دینی پڑتی ہے مشاعروں کی سرپرستی بھی کرتے ہیں اور کسی شعر پر لوگوں کو داد دیتے دیکھ کر ہم بھی سر ہلا کر" ایگزیکٹلی ایگزیکٹلی" کہتے ہیں۔ کسی ڈنر میں شمولیت کے لیے بھوکے گھر سے نکلتے ہیں اور بھوکے ہی گھر واپس آجاتے ہیں کہ ایسی محفلوں میں کھانے کی بجائے سونگھنے کے عمل کو زیادہ مہذب اطوار میں شامل سمجھا جاتا ہے یہ اور اس نوع کے دیگر بہت سے امور ہیں جہاں ہم ایسے "کلچرڈ" لوگوں کو ایسا رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس سے کسی کو ہم پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔! ہم لوگ "جینٹری" میں شامل ہیں اور اسی میں شامل رہنا چاہتے ہیں!

اس کے برعکس عوام الناس ہیں، جنہیں تہذیب چھو کر بھی نہیں گزری، یہ لوگ کھانے کے بعد بھرپور طریقے سے ڈکار مارتے ہیں اور مزید ستم یہ کہ ایسے موقع پر پوری ڈھٹائی سے" الحمدللہ"

بھی کہتے ہیں۔ بابو ہوٹل میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ جہاں پورے زور سے ریکارڈنگ ہو رہی ہوتی ہے اور اس سے زیادہ بلند آواز میں یہ لوگ باتیں کرتے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں۔ مشاعرے میں جاتے ہیں کھل کر داد دیتے ہیں اور ہوٹ کرتے ہیں۔ بھوک لگی ہو تو سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر حلیم کھاتے ہیں اور پھر کرتے سے منہ پونچھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں رونے کو جی چاہتا ہے تو پھوٹ پھوٹ کر رو بھی لیتے ہیں اور زندگی میں ہنسنے کا موقع پیدا نہ بھی ہو تو پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ بارہ آنے کی ٹکٹ لینے کے لیے قمیص اور بنیان اتار کر ایک دوسرے کے کاندھوں پر سے گزرتے ہوئے کھڑکی تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر ساری فلم کے دوران موقع بہ موقع اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کھل کر بڑھک بھی لگا دیتے ہیں۔

اوّل الذکر طبقہ یعنی "جینٹری" مال مست" ہے اور دوسرا طبقہ یعنی یہ عوام "حال مست"۔ اس طبقے کے بعض لوگ جینٹری میں شمولیت کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہی رہتے ہیں، ان میں سے کچھ تو خود کو نئی صورت حال میں ایڈجسٹ کر لیتے ہیں جبکہ بعض اس میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ ایک فلم شو کے دوران عوام الناس کے گروہ کا ایک فرد بوسکی کی قمیص اور شلوار پہن کر نیچے بارہ آنے میں بیٹھنے کی بجائے اوپر "جینٹری" کے ساتھ بیٹھ گیا۔ یہاں لوگ دم سادھے فلم دیکھ رہے تھے اور نیچے اس کے بھائی بند مختلف مواقع پر اپنے جذبات کا اظہار با آواز بلند کرتے۔ مثلاً اگر وہ ولن کو کسی پر ظلم و ستم کرتے دیکھتے تو گالیاں دے دے کر ان کا گلا بیٹھ جاتا۔ کسی اچھے ڈائلاگ پر وہ تالیاں بجا بجا کر داد دیتے اور کمزور مکالموں پر وہ ہوٹنگ شروع کر دیتے۔ بوسکی کی قمیص اور شلوار والا شخص بے چینی سے اپنی سیٹ پر کروٹیں لے رہا تھا، پھر اچانک اس نے اپنے دائیں جانب بیٹھے ہوئے خاموش اور مہذب تماشائی کو بازو سے ہلایا اور کہا "جناب اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بڑھک لگا لوں" اس نے بُرا سا منہ بنایا اور کہا " اگر تم باز نہیں رہ سکتے، تو مجھ سے پوچھنے کا کیا فائدہ ہے، لگاؤ بڑھک" پھر اس بوسکی کی قمیص والے نے اپنے بائیں جانب والے کلرڈ شخص سے اجازت طلب کی اور اپن اوسی سے ملنے چہر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے منہ کے گرد دونوں ہاتھ رکھے اور چیخ کر کہا " اوئے شیدے! دل کے بڑھکاں لا، میں جینٹری وچ پھس گیا آں" (اوئے شیدے، خوب بڑھکیں لگاؤ میں تو جینٹری میں پھنس گیا ہوں)

جنیٹری! جو ولن کو ظلم وستم کرتے دیکھ کر خاموشی سے بیٹھی رہتی ہے، جو کسی مضحک منظر پر اپنے قہقہوں کا گلا دبا دیتی ہے، جو کسی درد انگیز سین پر اپنے آنسو آنکھوں کی دہلیز سے باہر نہیں آنے دیتی۔ جنیٹری! جو پوری خاموشی سے یہ ساری فلم دیکھ رہی ہے!

۲۷ر فروری ۱۹۷۶ء

دھوتی پر پابندی

جس چیز نے ہمیں مخمصے میں ڈال رکھا ہے وہ یہ ہے کہ دھوتی پر پابندی کا اطلاق صرف کوچوانوں پر کیوں کیا گیا ہے؟ ممکن ہے عوام کو اس ضمن میں کوچوانوں سے زیادہ سنگین نوعیت کی شکایات ہوں۔ اگر ایسا ہے تو بھی پابندی کا یہ دائرہ وسیع کیا جا سکتا تھا مثلاً یہ پابندی سائیکل سواروں کے لیے بھی ہونی چاہیئے جو بایاں پاؤں پیڈل پر رکھنے کے بعد داہنی ٹانگ کو ایک چکر دیتے ہوئے گدی پر سوار ہوتے ہیں اس کے بعد سائیکل سے اترتے وقت بھی وہ شارع عام پر یہی حرکت کرتے ہیں۔ اسی طرح اس پابندی کا اطلاق پیدل چلنے والوں پر بھی ہونا چاہیئے کہ وہ ماتھے کا پسینہ اکثر دھوتی کے پلو سے پونچھتے ہیں۔ علاوہ ازیں گرمیوں میں وہ اس لباس کو مزید ہوادار بنانے کے لیے ہر ممکن اقدام کرتے ہیں۔ اگر اس نعمت سے لوگوں کو محروم کرنا ہی ہے تو پھر رات کو گلیوں میں سوئے ہوئے عوام پر بھی یہ پابندی عائد ہونی چاہیئے کہ صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو وہ دھوتی پکار رہے ہوتے ہیں۔

۱۷ر جولائی ۱۹۷۷ء

بے خواب آنکھوں کا سفر

لاہور سے پنڈی جانے کے لیے میں نے گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی اس بس کے لیے ٹکٹ حاصل کیا جو آٹھ بجے شب روانہ ہونی تھی مگر ہوا یوں کہ ساڑھے آٹھ بجے جانے والی بس اس سے پہلے روانہ ہوگئی اور اس کے بعد ۹ بجے والی بس نے بھی "رختِ سفر" باندھا اور عازم پنڈی ہوگئی آٹھ بجے والی بس ۹ بجے والی بس کے بعد اڈے سے باہر نکل سکی کیونکہ "پارکنگ" کرتے وقت فرسٹ کم فرسٹ سرو FIRST COME FIRST SERVE کے اصول کو مدنظر رکھا گیا تھا اور یہ امر ذہن سے نکال دیا گیا تھا کہ جو بس اڈے میں داخل ہوئی ہے، اسے بالآخر وقتِ مقررہ پر اڈے سے نکلنا بھی ہے بہر حال یہ مانسہرے جانے والی بس تھی جس کا ایک سٹاپ پنڈی بھی تھا اور اب یہ مسافروں سے پوری طرح بھر چکی تھی بس میں تبلیغی جماعت کا ایک گروپ سوار تھا جو اپنے امیر کی ہدایت کے مطابق ذکر میں مصروف تھا۔ میرے برابر میں ڈیرہ غازی خاں کا ایک نوجوان بیٹھا تھا جو بہشام میں واقع جانوروں کے ایک ہسپتال میں ملازم تھا اور اس علاقے میں بھیڑوں کی بیماری پھیل جانے کے باعث ایک نایاب دوا خرید کر لاہور سے واپس جا رہا تھا اسے ساری رات اور پھر اگلے دن بھی سفر کرنا تھا کیونکہ اس کے مطابق یہ بس دو بجے رات پنڈی پہنچنا تھی وہاں سے اسے ایبٹ آباد اور پھر مانسہرے جانا تھا اور بعد ازاں بغیر نشستوں والی جیپ میں اکڑوں عالم میں بہشام پہنچنا تھا وہ چہرے مہرے سے ناخواندہ اور اپنی گفتگو سے نیم خواندہ لگتا تھا۔ اگلی سیٹ پر تین نوجوان براجمان تھے اور اپنی گفتگو سے پڑھے لکھے دکھائی دیتے تھے بس نے سفر کا آغاز کر دیا تھا میرے

ہم نشست نے سر پر مفلر لپیٹا اور پھر اونگھنے لگا حتیٰ کہ اس کا سر اگلی نشست کے ساتھ جا لگا۔ تبلیغی جماعت کے ارکان گردن جھکائے مسلسل ذکر میں مصروف تھے اور میرے سامنے والی نشست پر بیٹھے تینوں نوجوان پوری طرح کسی بحث میں الجھے ہوئے تھے میرا دھیان ان کی باتوں کی طرف نہیں تھا کیونکہ میں نے ایک رسالہ نکال لیا تھا اور اب اس کی ورق گردانی میں مشغول تھا۔ تھوڑی دیر بعد اگلی نشست کے مسافروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں اور میری توجہ رسالے سے ہٹ کر ان کی طرف مبذول ہو گئی۔ بائیں جانب سے پہلا نوجوان کہہ رہا تھا

"ملک میں انٹی پیپل سرگرمیوں پر کوئی قدغن نہیں مگر انٹی پیپلز پارٹی سرگرمیوں کی پاداش میں جیلیں بھر دی جاتی ہیں۔"

"حکومت اس میں حق بجانب ہے کیونکہ پیپلز پارٹی عوام کے ووٹوں سے برسر اقتدار آئی ہے اس لیے اس کے خلاف سرگرمیاں انٹی پیپل سرگرمیاں ہیں" دوسرے نوجوان نے بھی اتنے ہی جوش و خروش سے یہ باتیں کہیں، جتنے جوش و خروش سے پہلا نوجوان بول رہا تھا۔

"ملکی استحکام کا دارومدار جمہوریت پر ہے ملک میں جمہوری اداروں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جانا چاہیئے کیونکہ اس صورت میں عوام اسلام کے حق میں فیصلہ دیں گے اور اسلامی نظام ہی ملکی استحکام کا باعث بن سکتا ہے کیونکہ اس ملک کی بنیاد اسلام ہی پر ہے لیکن پیپلز پارٹی کبھی اس ملک میں جمہوریت کو پھلنے پھولنے نہیں دے گی کیونکہ اس صورت میں وہ کبھی برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتی۔" تیسرے نوجوان نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے دھیمے لہجے میں یہ باتیں کہیں۔

"تم کون سے اسلام کی بات کر رہے ہو، مولانا مودودی کا اسلام جو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا محافظ ہے یا ابوذر غفاریؓ کا اسلام جو غریبوں کی پشت پناہی کرتا ہے اور انہیں حوصلہ دیتا ہے۔" پیپلز پارٹی کی حمایت میں گفتگو کرنے والا نوجوان پہلے شخص کو چھوڑ کر اس نوجوان سے الجھ پڑا۔

"ہاں ہاں بولو، جواب دو!" پہلے نے دوسرے کی ہم نوائی میں گردن ہلائی۔

"تم گفتگو کو الجھانے کی کوشش نہ کرو۔" اسلامی نظام کی بات کرنے والے نوجوان نے جواب دیا "جب عوام اسلامی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، اس وقت انہیں اس کی جزئیات طے کرنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کیونکہ کئی برس پیشتر تمام فرقوں کے علماء

اسلام کے بنیادی اصولوں پر اتفاق رائے کا اظہار کر کے ایک دستاویز پر دستخط کر چکے ہیں۔"

اس اثناء میں سامنے سے غلط موڑ کاٹنے والی بس سے بچاؤ کے لیے ہماری بس کے ڈرائیور نے بریکیں لگائیں جس پر میرے برابر میں بیٹھا ہوا نوجوان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اس نے اپنے سر کو ہاتھ لگایا اور پھر کہا۔"میرا مفلر کہاں ہے"؟ مفلر اس کے پاؤں کے بیچے سے برآمد ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اسے سر پر باندھا اور اگلی سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر دوبارہ خراٹے لینے لگا

تبلیغی جماعت کے افراد برابر ذکر میں مشغول تھے

"تم دونوں عوام دشمن نظریات کے حامل ہو"۔ گفتگو نجانے کہاں سے کہاں پہنچ چکی تھی اور اب پہلا نوجوان ان دونوں سے الجھ رہا تھا " غریب عوام کے دکھوں کا حل نہ اسلام میں پوشیدہ ہے اور نہ ہی اسلامی سوشلزم میں۔ انقلاب کا راستہ صرف مسلح جدوجہد کا راستہ ہے اس کے بغیر سکھ کا سورج طلوع نہیں ہو سکتا!"

" ہمارے ہاں برسرِاقتدار آنے والی حکومتوں میں ایک بھی اسلامی نہیں تھی، ان لوگوں نے محض اپنے اقتدار کے لیے اسلام کا نام لیا اور اب پیپلز پارٹی اسلام اور سوشلزم دونوں کا نام لیکر بیک وقت اسلام پسند اور سوشلسٹ حلقوں کے ذریعے برسرِاقتدار رہنا چاہتی ہے" اسلامی نظام کے حامی نوجوان نے جواباً کہا۔

" یہ بالکل بکواس ہے پیپلز پارٹی نے عوام کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کیا اس نے جو منشور عوام کے سامنے پیش کیا تھا وہ بتدریج اسے عملی جامہ پہنا رہی ہے حکومت کے پاس الہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ وہ ربع صدی کے مسائل چند برسوں میں حل کر دے"۔ دوسرے نوجوان نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

کھڑکی کا شیشہ پورے طور پر بند نہ تھا۔ چنانچہ میرے برابر میں بیٹھا نوجوان ایک بار پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور سر کو ٹٹولتے ہوئے کہنے لگا " میرا مفلر کہاں ہے"؟ اس بار یہ مفلر سیٹ کی دوسری طرف سے برآمد ہوا اور نوجوان نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

تبلیغی جماعت کے ارکان اسی خضوع وخشوع کے ساتھ ذکر میں مشغول تھے۔

اب یہ تینوں نوجوان بہت اونچی آواز میں بولنا شروع ہو گئے تھے۔ ان کی آوازیں گڈمڈ ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ گفتگو دلائل سے نکل کر جھگڑے کی حدود میں داخل ہو چکی تھی ان میں سے کسی کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی بس اتنا پتہ چلتا تھا کہ ان میں سے ایک اسلام دوسرا اسلامی سوشلزم اور تیسرا سوشلزم کا نام لے رہا تھا۔ ان کی آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں حتیٰ کہ بس کے دیگر مسافروں نے بھی مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اس اثنا میں تبلیغی جماعت کے ارکان نے بھی تھوڑی دیر کے لیے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ سر جھکا کر ذکر میں مشغول ہو گئے۔

میرے برابر والے نوجوان کی آنکھ ایک بار پھر کھل گئی تھی اس نے سر کو ٹٹولا اور مفلر کو اپنی جگہ موجود پا کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک گولی نکالی اور میرے بے خواب چہرے کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''میں نے سیلپنگ پل کھائی ہوئی ہے تم بھی ایک کھا لو اور سو جاؤ'' اس نے گولی میری ہتھیلی پر رکھی اور ایک بار پھر سر سیٹ کے ساتھ ٹکا کر خراٹے لینے لگا۔ تبلیغی جماعت کے ارکان بھی اس سارے جھگڑے سے بے نیاز دوبارہ آنکھیں بند کر کے ذکر میں مشغول ہو گئے تھے۔

بس کا ڈرائیور بوجھل آنکھوں سے بس ڈرائیو کر رہا تھا۔ دائیں اور بائیں جانب گھپ اندھیرا تھا۔ سامنے دو سو گز کا ٹکڑا روشنی کے دائرے میں تھا، اس سے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا!

۱۲ر مارچ ۱۹۷۶ء

ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامۂ لاہور

ان دنوں جو پاکستانی ادیب بھی بیرون ملک جاتا ہے وہ واپسی پر سفر نامہ ضرور لکھتا ہے۔ اس سے ہم نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ جو غیر ملکی پاکستان آتے ہوں گے واپسی پر وہ بھی یقیناً ایک عدد سفر نامہ قلمبند کرتے ہوں گے جس طرح ہمارے ہاں کے بعض سیاح کسی غیر ملک میں گزارے ہوئے چند گھنٹوں ہی سے اس کی پوری تہذیب اور تمدن کا کچا چٹھا کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں اسی طرح ممکن ہے بعض غیر ملکی سیاح بھی شیر ایکسپریس پر پاکستان کا ایک چکر کاٹنے کے بعد اپنے قارئین کو پاکستانی عوام اور یہاں کی معاشرت کے بارے میں فیصلہ کن معلومات دے ڈالتے ہوں، سو ہم نے چشم تصور میں ایک ایسے غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ ملاحظہ کیا ہے جس نے ایک دو روز لاہور میں قیام کیا اور پھر اپنے تاثرات ایک کتابی صورت میں پیش کر دیئے اس "سفر نامے" کا ایک باب آپ بھی ملاحظہ فرمائیں

سرخ فوج سے سامنا

جب میں نے لاہور ریلوے سٹیشن پر قدم رکھا تو سُرخ وردیوں میں ملبوس ایک ہجوم نے مجھ پر دھاوا بول دیا۔ ان میں سے کوئی میرا دامن کھینچ رہا تھا اور کسی کا ہاتھ میرے گریبان پر تھا۔ میں نے پاکستان کے بارے میں سنا تھا کہ وہاں ان دنوں سوشلزم کا تجربہ کیا جا رہا ہے چنانچہ سب سے پہلے میرا سامنا سرخ فوج کے ان سپاہیوں ہی سے ہوا مگر ان کے چہرے زرد تھے گال پچکے ہوئے تھے اور آنکھیں اندر کو دھنسی تھیں ان میں بچے بھی تھے اور کمر خمیدہ بوڑھے بھی۔ ان کے جسم لاغر تھے اور آنکھوں میں

بے چارگی تھی۔ پیشتر اس کے کہ میں عجلت میں کوئی فیصلہ کر بیٹھتا۔ میری نظر سرخ وردیوں ہی میں ملبوس کچھ دوسرے افراد پر پڑی جو دیگر مسافروں کا سامان لڑکھڑاتی ٹانگوں کے ساتھ سر پر اٹھائے گیٹ سے باہر نکل رہے تھے تب میں نے جانا کہ یہ سوشلسٹ نہیں بلکہ وہ کھاد ہیں جس سے سوشلزم کے کھیت کی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے، ان محنت کشوں کی قمیص پر "فی پھیرا آٹھ آنے" لکھا تھا۔ بعد میں ایک پاکستانی دوست نے مجھے بتایا کہ انہیں استعمال کرنے والے انقلابیوں کی قمیضوں پر "فی پھیرا۔ ——— ایک غیر ملکی پھیرا" لکھا ہوتا ہے

ایک حیرت انگیز رسم

میرے لیئے یہ امر باعث حیرت تھا کہ پاکستان میں عورتوں اور مردوں سے کہیں زیادہ مردوں اور مردوں کو اختلاط کی آزادی حاصل ہے کیونکہ میں نے بے شمار نوجوانوں کو دیکھا جو ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے خراماں خراماں چلے جا رہے تھے اسی طرح میں نے مردوں کو عورتوں سے زیادہ "سیکسی" لباس میں ملبوس پایا۔ انہوں نے سکرٹ قسم کی کوئی چیز (دھوتی) پہنی ہوئی تھی جسے وہ اتنا اوپر اٹھا کر چلتے تھے کہ وہ منی سکرٹ بلکہ مائیکرو منی سکرٹ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ میں نے لوگوں کو بر سر عام کسی ایسی دیوار کی طرف منہ کر کے، جس پر کسی گدھے کی تصویر بنی ہوئی تھی "دھواں دھار" حرکت کرتے ہوئے بھی پایا۔ کئی ایک لوگوں کو اس کام سے فراغت کے بعد اپنے محرک ہاتھ کے ساتھ اِدھر اُدھر ٹہلتے بھی دیکھا۔ اگلے روز میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی "شارع عام پر فحش حرکات کرتے ہوئے گرفتار۔" یقیناً وہ یہی لوگ ہوں گے۔

مرحوم کس طرح فوت ہوئے تھے؟

تعزیت کے لیے آنے والے لوگ مرنے والے کے کسی قریبی عزیز سے پہلے تعزیت کے کلمات کہتے ہیں اور پھر ان میں سے ہر کوئی یہ سوال پوچھتا ہے کہ مرحوم کس طرح فوت ہوئے تھے؟ دراصل یہ سوال تعزیت کا حصہ ہی سمجھا جاتا ہے چنانچہ مرحوم کا وہ عزیز وفات سے تین چار روز قبل کے واقعات خصوصاً مرنے سے چند گھنٹے قبل کے واقعات پوری تفصیل سے سناتا ہے اور کسی ایک خاص مقام پر پہنچ کر دھاڑیں مارنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوئی دوسرا شخص تعزیت کے لیے آتا ہے اور پوچھتا ہے "مرحوم فوت کس طرح ہوئے تھے؟" چنانچہ وہ

یہ داستانِ غم ایک بار پھر پوری تفصیل سے سناتا ہے اور مقررہ وقت پر پھر دھاڑیں مارنے لگتا ہے یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک تعزیت کرنے والے آتے رہتے ہیں اور پوچھتے رہتے ہیں کہ مرحوم آخر فوت کس طرح ہوئے تھے؟ حتیٰ کہ مرحوم کا وہ عزیز نڈھال ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہر تعزیت کرنے والے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں بتاتا ہے کہ مرحوم دراصل اس طرح فوت ہوئے تھے !!

مُردوں کو فرائی کرنا

کسی محفل میں میری ملاقات ایک سوگوار شخص سے ہوئی جس کے والد کو فوت ہوئے کچھ عرصہ گزرا تھا۔ وہ اپنے والد کی وفات سے متعلق گفتگو کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا "پورے نومن گھی خرچ ہوا ہے" اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ شائد یہاں مُردوں کو تَل کے دفن کیا جاتا ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ میرا یہ اندازہ درست نہیں تھا کیونکہ متذکرہ شخص کا نومن گھی جہلم کی رسومات کی ادائیگی کے سلسلے میں خرچ ہوا تھا۔

حاضرین کو چھوہارے مارنا

یہاں شادی کے موقعہ پر ایک رسم یہ ہے کہ نکاح سے فراغت کے بعد دولہا کے کوئی عزیز محفل میں موجود حاضرین کو چھوہارے مارتے ہیں اسے یہاں چھوہارے لٹانا کہا جاتا ہے۔ ایک چھوہارا میری ناک کو بھی لگا جس کے باعث ناک کئی دن تک سوجی رہی۔ چھوہارے کے بارے میں وضاحت کر دوں کہ جب کھجور پڑی پڑی سوکھ جائے تو یہاں کے لوگ اسے چھوہارا کہنے لگتے ہیں نیز یہ کہ چھوہارے کی شکل صرف چھوہارے سے ملتی ہے۔

جوتی چرانے کی رسم

اس موقع پر دولہا کی سالیاں اپنے بہنوئی کو جوتیاں اتار کر بیٹھنے پر زور دیتی ہیں چنانچہ جب وہ جوتیاں اتارتا ہے تو موقع پاکر یہ سالیاں جوتی غائب کر دیتی ہیں۔ بعد میں اس جوتی کی واپسی کے لیے دولہا کو منہ مانگی رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ جوتی چرانے کی یہ رسم شادی بیاہ کے علاوہ ہر جمعہ کو مسجدوں کے باہر بھی ادا کی جاتی ہے اور یہ رسم سالیاں ادا نہیں کرتیں ممکن ہے یہ رسم سالے ادا کرتے ہوں تاہم میں نے اس ضمن میں کوئی تحقیق نہیں کی۔

حیرت انگیز صنعتیں

پاکستان کے متعلق میرا تاثر یہ تھا کہ یہ صنعتی طور پر بھی خاصا پسماندہ ملک ہے، چنانچہ یہ ابھی تک اس معاملے میں خود کفیل نہیں ہو سکا، مگر لاہور میں چند روزہ قیام کے دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ پاکستان میں صنعتوں کا جال بچھا ہوا ہے، بلکہ یہاں ایسی ایسی صنعتیں موجود ہیں جو ابھی تک تمام تر ترقی کے باوجود یورپ وغیرہ میں بھی قائم نہیں ہو سکیں۔ مثلاً ایک دوست نے ان کی تفصیل بتاتے ہوئے صنعت اشتقاق، صنعت شبہ اشتقاق اور صنعت طباق وغیرہ کا نام لیا۔ ان بڑی صنعتوں سے منسلک اس نے سمال انڈسٹریز کی تفصیل بھی بتائی۔ جو ایک اور صنعت "صنعت تجنیس" کے تحت قائم ہیں مثلاً تجنیس تام، تجنیس تام مماثل اور تجنیس تام مستوفی وغیرہ، میرے لیے یہ بالکل نئی صنعتیں تھیں، چنانچہ میں نے اپنے دوست سے اس ضمن میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ صنعتِ اشتقاق سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کا جمع ہونا ہے جو ایک ہی مادہ یا مصدر سے مشتق ہوں۔ اسی طرح اس نے دیگر صنعتوں کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا لیکن اس کے باوجود میں ان صنعتوں کی نوعیت نہ سمجھ سکا۔ تاہم میں نے اس سے پوچھا کہ ان صنعتوں کی بدولت کتنے لوگوں کو روزگار حاصل ہوا ہے؟ تو دوست نے کہا کہ ان صنعتوں سے بے شمار شاعر وابستہ ہیں اور تمام بے روزگار ہیں

• عطاء الحق قاسمی کی زیرِ ترتیب کتاب کا ایک باب

ایک گونگا کالم

"پرانی یادوں کو بھلا دینے والا، دلوں میں دبی ہوئی خواہشات پوری کرنے والا۔ آپ کا جانا پہچانا شہکار نئے نظاروں کے ساتھ دکھایا جا رہا ہے۔ انٹرول سے پہلے دلفریب سائیڈ پروگرام دیکھئے!"

"حسن کے متوالوں کے لئے رنگین تحفہ، حسینوں کی مستی بھری ادائیں، نئے ہنگامے، نئے ہیجان خیز نظارے میڈم باوری، لیڈی جوزفین اور فنی گرل سے زیادہ پاور فل، انٹرول سے پہلے نیا رنگین پروگرام ضرور دیکھیں۔"

"زبردست دھماکہ، آپ کی خواہشات کے عین مطابق دھماکہ۔ سہاگ کی مکمل داستان جسے دیکھ کر آپ بے اختیار خراجِ تحسین پیش کریں گے ہمراہ رنگا رنگ سائڈ پروگرام دیکھنا نہ بھولئے گا۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔"

"سٹال آٹھ روپے، گیلری دس روپے، سٹال آٹھ روپے، گیلری دس روپے۔

"یہ لو چالیس روپے، چار ٹکٹیں دے دو۔ لیکن اندر کچھ ہے کہ نہیں؟۔"

"اللہ جانتا ہے جی، سٹال آٹھ روپے گیلری دس روپے"

"اب آپ اپنا قومی ترانہ سنیں گے۔ آپ پر لازم ہے کہ اس کے احترام میں خاموش اور با ادب کھڑے ہو جائیں۔ پاک سرزمین شاد باد"

"اوئے بارہ آنے والیو، شور مچاؤ۔ فلم ختم ہونے والی اے"

"وخا اوئے، تیری.... تیری...."

"اوئے !"

"چلا اوئے۔"

"تیری ....."

"تیری ....."

"او شیر دیا بچیا دل خوش کر دتا ای۔"

"..... زندہ باد۔"

"..... زندہ باد۔"

"چپ کر کے فلم دیکھو اوئے۔"

(دبی دبی سسکیاریاں، درمیان درمیان میں کبھی آہستہ اور کبھی باآوازِ بلند فحش تبصرے)

"لاہور (سٹاف رپورٹر) ایک درندہ صفت شخص نے گزشتہ روز اپنے ہمسائے کی آٹھ سالہ بچی کو ہوس کا نشانہ بنایا، معصوم بچی کے شور مچانے پر کچھ لوگ جمع ہو گئے اور اسے ملزم کے چنگل سے چھڑایا، بعد ازاں خون سے لت پت بچی کو ہسپتال لے جایا گیا مگر اس نے راستے ہی میں دم توڑ دیا!

"گزشتہ شب پانچ افراد ایک شادی شدہ خاتون کو گھر میں اکیلی پا کر اندر گھس گئے اور انہوں نے اسے باری باری ہوس کا نشانہ بنایا۔ پولیس نے مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔"

"بسوں میں طالبات کے ساتھ دست درازی کی وارداتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جن کے باعث شریف والدین سخت پریشان ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان بدقماش افراد کا سختی سے محاسبہ کیا جائے۔!"

"ہمیں بار بار کہا جاتا ہے کہ کسی نظریاتی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ نوجوان اس کا ہراول دستہ ہوں۔ ہم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بیان کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔ کہ نوجوانوں کی بڑی تعداد نظریاتی تحریکوں سے یکسر لاتعلق ہے۔ جنس کے دباؤ نے ان کے ذہنوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ....."

ن۔م۔راشد کے آخری لمحات

ساقی فاروقی چودہ برس لندن میں گزارنے کے بعد گزشتہ دنوں لاہور میں تھے۔ان کی وضع قطع، گفتگو اور سوچ کا انداز حتیٰ کہ چہرے کے نقوش بھی کچھ مغربی مغربی سے ہو گئے ہیں لیکن ایک چیز جو نہیں بدلی بلکہ دوسرے شاعروں کی نسبت ہم نے ان میں کچھ زیادہ ہی مشرقی انداز کی حامل پائی، وہ ان کے شعر سنانے کا ڈھنگ اور اس دوران داد وصول کرنے کا انداز تھا۔ شیزان اورنٹیل میں انہوں نے محمد خالد اختر، سجاد باقر رضوی، اظہر جاوید، خالد احمد، مستنصر حسین تارڑ، رشید ملک، محمد کاظم، نجیب احمد، عبداللطیف اختر اور محبوب خزاں کی موجودگی اور احمد ندیم قاسمی کی میزبانی میں جس مخصوص انداز میں شعر سنائے اور جس جس ڈھنگ سے داد وصول کی۔ وہ ہماری اس ادبی روایت کا حصہ ہے جو اب دم توڑ رہی ہے احباب کے اس "گیٹ ٹوگیدر" میں دوستوں نے ان سے صرف کلام ہی نہیں سنا، ن م راشد کے آخری لمحات کی کہانی بھی سنی کہ ساقی فاروقی نہ صرف یہ کہ ان کے قریبی دوستوں میں سے ہیں بلکہ انہیں دفن کرنے کی بجائے جلائے جانے کے واقعات کے چشم دید گواہ بھی ہیں انہوں نے جو کچھ یہاں بتایا وہ قریباً تمام کا تمام انکشافات ہی کے ضمن میں آتا تھا ان کے مطابق اس سارے واقعے کا پس منظر یہ ہے کہ ن۔م۔راشد نے لندن میں قیام کے دوران ایک بار مُردے کو جلائے جانے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ سارا کام اس نفاست سے کیا گیا اور اس میں صفائی کا کچھ اس قدر خاطر خواہ انتظام تھا کہ راشد یہ منظر دیکھ کر "ایکسائیٹڈ" ہو گئے اور انہوں نے

ان رسومات کی ادائیگی سے فراغت کے بعد واپس گھر جاتے ہوئے اپنی پروٹسٹنٹ بیوی شیلا سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ موت کے بعد اسی نفاست سے اپنا وجود تلف کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ انہیں دفنانے کی بجائے جلایا جائے۔ ساقی فاروقی نے بتایا کہ راشد نے نہ تو اس نوع کی کوئی تحریری وصیت چھوڑی تھی اور نہ ہی کبھی اپنے دوستوں میں سے کسی کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ جب ہم نے ان کی موت کی خبر سُنی تو سکتے میں رہ گئے اور جب ان کی اس وصیت کے بارے میں علم ہوا تو ہمارے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے حتیٰ کہ اس موقع پر "اداس نسلیں" والے عبداللہ حسین کے اندر کا پنجابی پاکستانی مسلمان بیدار ہو گیا اور انہوں نے فرطِ جذبات سے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا!" لیکن جب ان کے بیٹے شہریار نے بھی اپنے والد کی اس وصیت کی تائید کی، تو ہم بے بس ہو گئے، کیونکہ زندگی میں تو راشد پر ہمارا حق تھا، لیکن ان کی لاش کے وارث ہم نہیں، ان کا بیٹا تھا یا ان کی بیوی تھی! ساقی فاروقی نے اس امر کی تردید کی کہ راشد نے اپنی موت کے بعد ایصالِ ثواب کے لیے ختم قرآن مجید سے منع کیا تھا۔ تاہم اس کا اہتمام اس لیے نہ کیا گیا کہ جلانے کی رسم ادا کرنے کے بعد یہ فعل منافقت کے ضمن میں آتا تھا ساقی فاروقی اس محفل میں دراصل یہ بتانا چاہتے تھے کہ راشد کی اس وصیت کا باعث ان کا اسلام سے منحرف ہونا نہیں تھا۔ بلکہ صرف ایک خاص واقعے نے ان کے ذہن پر شدید اثر چھوڑا تھا اور اس کے اثر کے تحت انہوں نے اپنے ورثاء سے مرنے کے بعد جلائے جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا جس پر پوری طرح عمل کیا گیا۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ساقی فاروقی نے ایک حیرت انگیز انکشاف یہ بھی کیا کہ راشد کو قریباً نصف قرآن مجید پوری طرح حفظ تھا اور وہ گفتگو کے دوران (اپنی آخری سانسوں تک) آیات کے حوالے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی جائیداد کی تقسیم بھی عین اسلامی اصولوں کے مطابق کی یعنی بیٹوں میں نصف جائیداد تقسیم کرنے کی وصیت کی جب کہ بیٹیوں کو اسلامی شرع کے مطابق حصہ دیا۔ اسی طرح انہیں نہ صرف یہ کہ ہندوازم سے شدید نفرت تھی اور وہ زبردست "انٹی انڈیا" جذبات رکھتے تھے بلکہ آخری دنوں میں وہ ہمارے ساتھ مل کر پاکستان کے مفاد کے لیے منصوبے بھی سوچا کرتے تھے۔"

ہم نے ان سطور میں ساقی فاروقی کا "بیان" من وعن درج کر دیا ہے کیونکہ ان کا کہنا تھا

کہ راشد کے بارے میں پاکستانی عوام حقیقت حال سے واقف نہیں ہیں اور اس ضمن میں اخبارات نے واقعات کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہ تمام کی تمام درست نہیں ہیں اس ضمن میں انہوں نے دیانت دار صحافت کے نام پر ہم سے مطالبہ کیا تھا کہ تصویر کا یہ رخ بھی قارئین کے سامنے ضرور آنا چاہیئے۔ سو ہم نے ان کی یہ خواہش اور اپنا فرض پورا کر دیا ہے مگر اس کا کیا علاج کہ "اوراق" کے تازہ شمارے میں جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ راشد کو اپنے وطن کے مستقبل سے کہیں زیادہ نسلِ انسانی کے مستقبل کی فکر تھی وطن ان کے لیے کبھی باعث کشش نہیں تھا چنانچہ جب ان کا سلسلۂ ملازمت ختم ہو گیا تو ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا انتہائی مشکل تھا کہ اب وہ کس ملک میں سکونت اختیار کریں چنانچہ پاکستان یاترا کے موقع پر ان سے ملاقات ہوئی تو وہ عجیب تذبذب میں تھے کہنے لگے "جی چاہتا ہے اسلام آباد میں سکونت اختیار کر لوں، بیوی اٹلی میں رہنا چاہتی ہے، انگلستان بھی کوئی بری جگہ نہیں، بہر حال کہیں بھی رہ پڑیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کی مذہبی بغاوت کا ذکر بھی اپنے اس مضمون میں کیا ہے سو راشد کے بارے میں ساقی فاروقی اور ڈاکٹر وزیر آغا کی روایات ہم نے بیان کر دی ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد ہیں ؎

کس کا یقین کیجیے، کس کا یقیں نہ کیجیے
لائے ہیں بزمِ ناز سے یار خبر الگ الگ

۴ر اپریل ۱۹۷۶ء

ہرجانہ

رات کو ساڑھے نو بجے لاہور ریلوے اسٹیشن سے ماڈل ٹاؤن تک جانے کے لئے متعدد ٹیکسی ڈرائیوروں اور رکشہ ڈرائیوروں کی منت سماجت کے بعد جب مایوسی مقدر بن چکی تھی کہ اچانک روشنی کی ایک کرن طلوع ہوئی اور ایک ٹیکسی ڈرائیور فرشتۂ رحمت بن کر نازل ہوا۔ اس نے اٹیچی کیس اٹھا کر ٹیکسی میں رکھا اور گاڑی سٹارٹ کر کے ماڈل ٹاؤن کے راستے پر ڈال دی جناب صادق تین بھی میرے ہمراہ تھے۔ انہیں راستے میں باغ جناح کے اندر اوپن ائر تھیٹر میں اپنی رہائش گاہ پر جانا تھا۔ انہیں وہاں اتار کر میں جیل روڈ کے راستے ایک بار پھر ماڈل ٹاؤن کی طرف گامزن ہو گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنی سیٹ پر ترچھا بیٹھا تھا اور خاصی ترنگ میں تھا پہلے تو کچھ دیر تک وہ پنجابی اور اردو فلموں کے مقبول بول گنگناتا رہا اور ایک بار اس نے پاؤں سے تھاپ دینے کی کوشش بھی کی مگر اس سے گاڑی کی رفتار یکایک تیز ہو گئی کیونکہ اس کا پاؤں ایکسیلیٹر پر تھا۔ اس لحاظ سے مایوس ہو کر اس نے ریڈیو آن کر دیا مگر اس وقت وہاں سے فلمی نغموں کی بجائے حکومتی کارناموں کا ریکارڈ بجایا جا رہا تھا یا لگایا جا رہا تھا، سو اس نے ریڈیو بھی بند کر دیا۔ اب وہ میری طرف متوجہ تھا

"بابو جی! یہ مہنگائی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے، سمجھ نہیں آتی کہ غریب آدمی کہاں جائے"

وہ دیکھنے میں خوش پوش تھا اور گفتگو کا لہجہ بھی بتاتا تھا کہ وہ یکسر اَن پڑھ نہیں ہے

"صبر کیا جائے" میں نے اسے اسی طرح دلاسا دیا جس طرح پرسا دیا جاتا ہے۔!

" کیسے کیا جائے جی، دن بھر کی کمائی چینکیوں میں اڑ جاتی ہے، موڈ ہر وقت آف رہتا ہے بس یہی جی چاہتا ہے کہ سب سے لڑا جائے، چنانچہ سواریوں سے اکثر تلخ کلامی ہو جاتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ڈرائیور لوگ اجڈ اور وحشی ہوتے ہیں حالانکہ خدا گواہ ہے، ہم نے کبھی کسی کو ناجائز طور پر تنگ نہیں کیا"!

" وہ تو ٹھیک ہے مگر سواریاں بھی تو تمہاری طرح سفید پوش ہوتی ہیں، مہنگائی کے ہاتھوں ان کا ناطقہ بھی اسی طرح بند ہے سو ان کی سوچ بھی اپنی جگہ بجا ہوتی ہے"!

" ہاں جی یہ آپ ٹھیک کہتے ہیں" ڈرائیور نے پاسا بدلتے ہوئے کہا" اب دیکھیں نا ریلوے والوں نے گاڑیوں کے ٹائم کچھ ایسے رکھ دیئے ہیں کہ بیشتر گاڑیاں رات کو لاہور پہنچتی ہیں مسافر کراچی سے لاہور تک جتنا کرایہ ادا کر کے یہاں پہنچا ہوتا ہے اسے گھر تک پہنچنے کے لیے اتنی ہی رقم مزید ادا کرنی پڑتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ہم سے جھگڑا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ انہیں ریلوے والوں سے جھگڑنا چاہیئے"!

طویل سفر کی وجہ سے میں تھکا ہوا تھا اور مجھ پر غنودگی سی طاری تھی مگر اس کے یہ معنی خیز کلمات سن کر میری نیند اڑ گئی اور میں اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا" کیا مطلب"؟ میں نے اپنی اور اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے پوچھا۔

" یہی جی کہ پٹرول بہت مہنگا ہو گیا ہے، انجن آئل پٹرول سے بھی آگے نکل گیا ہے، گاڑیوں کے سپیئر پارٹس اوّل تو ملتے ہی نہیں اور اگر ملیں بھی تو انتہائی مہنگے داموں ملتے ہیں اور پھر شہر میں ٹیکسیوں کی تعداد بھی بہت کم ہے"۔

" ٹیکسی ڈرائیور ہوتے ہوئے بھی اس ضمن میں تمہاری معلومات درست نہیں ہیں۔" میں نے کہا" شہر میں ٹیکسیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے"۔

" ہو گی جی! ہمیں اس سے کیا"۔ وہ نجانے کیوں اس بات پر ہنسا" میں تو آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ جب رات کو منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے سواریوں کو زیادہ پیسے ادا کرنے پڑتے ہیں تو وہ خواہ مخواہ ہم سے الجھ پڑتے ہیں حالانکہ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ ہم تو غریب لوگ ہیں"۔

ماڈل ٹاؤن اب قریب آنے کو تھا اس نے جیب سے گولڈ لیف کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ

میری طرف بڑھایا

"شکریہ! میں اگر برانڈ تبدیل کر دوں تو میرا گلا خراب ہو جاتا ہے حالانکہ ایک وقت تھا جب ہر برانڈ میرا برانڈ تھا مگر اب ایک ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ بصورت دیگر....."

"گلا خراب ہو جاتا ہے" اس نے میرا فقرہ مکمل کیا اور تمام سفر کے دوران دوسری بار ہنسا "اب دیکھیں جی یہ سگریٹ حاصل کرنے کے لیے مجھے پورے چھ میل کا چکر کاٹنا پڑا۔ بالآخر سمن آباد کی ایک دکان سے یہ آٹھ روپے میں ملا۔ آپ ہی بتائیں غریب آدمی کہاں جائے ہم جب سواریوں سے چار پیسے زیادہ مانگتے ہیں تو وہ ہم سے جھگڑ پڑتے ہیں حالانکہ انہیں...."

"گولڈ لیف والوں سے جھگڑنا چاہیئے" اس بار میں نے اس کا فقرہ مکمل کر دیا اور پھر اٹیچی کیس پکڑ کر اتر گیا کیونکہ ماڈل ٹاؤن آ گیا تھا۔ میں نے ریلوے اسٹیشن سے ماڈل ٹاؤن تک کا کرایہ ادا کر دیا تھا اور آٹھ روپے اس کے علاوہ تھے جن سے اس غریب آدمی نے گولڈ لیف خریدنا تھا

۱۲ اپریل ۱۹۷۶ء

کلمہ سناؤ

ہم عارف مرحوم کے پیچھے سر جھکائے، آنکھیں نیم وا کیے، ذکر و فکر میں مشغول چلے جاتے تھے کہ سامنے سے گاؤں کے میراثی کا گزر ہوا۔ عارف مرحوم نے تبلیغی جماعت کے روائتی مفکرانہ انداز میں اس سے دو منٹ گفتگو کے لئے مانگے، وہ رکا تو عارف نے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اسے جماعت کے مخصوص عاجزانہ انداز میں کہا "بھائی کلمہ سناؤ!" اس پر اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے اور وہ ہڑبڑا کر بولا "کیا بات ہے، کلمہ بدل گیا ہے!!!"

۲۷ جون ۱۹۷۷ء

برگد کے نیچے

میں اور میرا ساتھی شہر کی ایک ماڈرن بستی میں چہل قدمی کرتے ہوئے دُور نکل گئے یہ امیر ترین لوگوں کی بستی تھی اور یہاں رہنے والے تمام آسائشوں سے بہرہ ور تھے ہمارے قریب سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی چمکیلی کار گذر جاتی، جس میں خوشنما چہرے خوشنما لبادوں میں ملبوس بیٹھے نظر آتے۔ سڑک کے دونوں طرف جدید طرز کے بنگلے ایستادہ تھے جن کے وسیع و عریض لان میں اودے اودے، نیلے نیلے اور پیلے پیرہنوں والے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے، یہ باہر کے خیرہ کن مناظر تھے۔ جنہیں ہماری آنکھیں دیکھ سکتی تھیں۔ ان بنگلوں کے اندر کی دنیا ہم سے اوجھل تھی

چلتے چلتے غیر ارادی طور پر میں اور میرا ساتھی سڑک کے دائیں ہاتھ ایک ڈھلوان میں اتر گئے اور ہمیں یوں لگا جیسے الف لیلیٰ کے ابوالحسن کو عالیشان محل اور حسین کنیزوں کے جھرمٹ سے اٹھا کر واپس اسی ماحول میں بھیج دیا گیا ہے، جہاں سے اسے لایا گیا تھا۔ ہمارے سامنے ایک کچی سی گلی تھی، جس کے نکڑ پر چائے کی دکان تھی جسے "پردیسی ہوٹل" کا نام دیا گیا تھا۔ بائیں جانب ایک ٹیلے پر کسی بزرگ کا مزار تھا اور یہاں سبز علم لہرا رہے تھے دائیں جانب ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور یہاں میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس بچے مولوی صاحب سے قرآن مجید پڑھ رہے تھے یہ گلی ذرا آگے چل کر چوڑی ہوگئی تھی اور اس کے درمیان میں کنواں تھا۔ ایک عورت کنویں میں سے بوکے کے ذریعے پانی نکال رہی تھی اور

دوسری عورت اپنی باری کے انتظار میں بالٹی پاؤں میں رکھے منڈیر پر بیٹھی تھی۔ سامنے والے مزار کے صحن میں ایک سفید ریش بزرگ کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے اور سینکڑوں کبوتر ان کے گرد جمع تھے مزار سے ذرا ادھر برگد کا ایک پرانا درخت اپنی جڑیں زمین کے اندر اور باہر پھیلائے کھڑا تھا۔ میں اور میرا ساتھی چلتے چلتے تھک گئے تھے، ہم نے برگد کے نیچے رومال بچھایا اور سستانے کے لیے بیٹھ گئے

"تم چائے پیؤ گے"؟ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا جس کے چہرے پر تھکن کے آثار کچھ زیادہ نمایاں تھے۔ وہ میرے لیے ان رستوں پر چل نکلا تھا ورنہ وہ ایسی مسافتوں کا عادی نہ تھا۔

"ہاں" اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے جواب دیا۔

میں اٹھ کر پردیسی ہوٹل کی طرف گیا اور چائے کے دو کپ بنوا کر لے آیا۔ دکان کے مالک نے اپنے دوسرے گاہکوں کے برعکس ہمارے صاف ستھرے کپڑے دیکھ کر نہ صرف یہ کہ الماری سے دو ایسے کپ نکلوائے تھے جن کے کنارے ٹوٹے ہوئے نہیں تھے بلکہ انہیں دھویا بھی بڑے اہتمام سے تھا۔ میں نے برگد کے نیچے پہنچ کر پلیٹ میں گری ہوئی چائے زمین پر انڈیلی اور پھر ایک کپ اپنے ساتھی کو تھما دیا

"یہاں کتنا سکون ہے" میرے ساتھی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا "تم دیکھ رہے ہو کہ پاس سے گزرنے والے لوگوں کی نظروں میں کتنی پاکیزگی ہے اور وہ اس طرح سلام کر کے گزر رہے ہیں جیسے برسوں سے ہمارے آشنا ہوں۔"!

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں لیکن اپنے بائیں جانب اس بوڑھی عورت کو دیکھو!" میں نے اس طرف اشارہ کیا جہاں ایک ضعیف عورت پاؤں کے بل بیٹھی پانی ایسے شوربے میں روٹی بھگو بھگو کر کھا رہی تھی اس کے کپڑے تار تار تھے

"چچ چچ چچ" میرے ساتھی نے اپنے دکھ کا اظہار کیا "میری جیب میں اس وقت پیسے نہیں ہیں تم فی الحال پانچ روپے اسے دے دو"

میں نے آگے بڑھ کر بوڑھی عورت کو پانچ کا نوٹ دیا اس نے خوشی سے کانپتے ہاتھوں

کے ساتھ یہ نوٹ ہاتھوں میں لے لیا اور پھر غور سے اسے دیکھنے لگ گئی اس کے دو منٹ دعاؤں میں صرف ہو گئے اور پھر اس نے یہ نوٹ قمیض کے دامن میں باندھتے ہوئے پوچھا "بیٹے! یہ کتنے کا نوٹ ہے؟"

مجھے یوں لگا کسی نے میرا کلیجہ مسل دیا ہو اور میں اس کی بات کا جواب دیئے بغیر واپس برگد کی چھاؤں میں آکر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دوبارہ چند گو پر واقع جدید طرز کی بستی میں ہونگے جہاں سڑک کے دونوں طرف جدید طرز کے بنگلے ایستادہ تھے جن کے وسیع و عریض لان میں رنگ برنگ پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ دائیں جانب واقع ایک سینک بار کے باہر نئے ماڈل کی کاریں کھڑی تھیں جن میں بیٹھے ہوئے خوش لباس اور خوشنما چہرے آئس کریم کھا رہے تھے وہ بستی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی جہاں ایک مسجد میں بچے لہک لہک کر قرآن مجید پڑھ رہے تھے جہاں مزار پر سبز علم لہرا رہے تھے اور جس کے صحن میں ایک بزرگ کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے جہاں کنویں میں سے عورتیں پانی نکال رہی تھیں، جہاں پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک ضعیف عورت پانی ایسے شوربے میں باسی روٹی کے لقمے بھگو کر کھا رہی تھی۔

اور جہاں برگد کا ایک درخت تھا جس کے سائے تلے "عجوبہ" بستیاں دیکھنے کے لیے آنے والے ہم لوگ بیٹھتے ہیں اور کچھ دیر سستانے کے بعد واپس اپنی روشن بستیوں کو لوٹ جاتے ہیں۔

۱۶ ر اپریل ۱۹۷۶ء

یہاں اختلاف کرنا منع ہے!

لاہور کے در و دیوار دو طرح کی عبارتوں سے مزین نظر آتے ہیں، ایک تو وہی "مایوس" نوجوانوں سے متعلق کہ جنہیں پڑھ پڑھ کر اب ہم سوچنے لگے ہیں کہ اگر صحیح صورت حال یہی ہے تو آخر ملک میں نسلِ انسانی کی افزائش کا سلسلہ جاری کس طرح ہے؟ اور دوسری عبارت تنبیہی قسم کی ہے، جس کے مخاطب وہ راہگیر ہوتے ہیں جنہیں بوقتِ ضرورت ڈھونڈے سے بھی کوئی "گوشۂ عافیت" نظر نہیں آتا اور بامر مجبوری تمام اخلاقی اقدار و وضعداریاں بالائے طاق رکھتے ہوئے کسی دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں یا بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے شہر کی تمام دیواروں پر "یہاں پیشاب کرنا منع ہے" کی عبارت جلی حروف میں لکھی ہوئی نظر آتی ہے لیکن یہ عبارت اتنی ہی "موثر" ثابت ہوتی ہے جتنی کہ "نکاسِ آب" کا معقول انتظام نہ ہونے کی صورت میں ہونی چاہیئے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کثرتِ آب سے دیواروں کی بنیادیں کمزور ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور پھر ان دیواروں کے مالک متذکرہ عبارت لکھنے کی بجائے وہاں ایک عدد گدھے کی تصویر بناتے ہیں اور اس کے نیچے مزید جلی حروف میں یہ عبارت درج کرتے ہیں "وہ دیکھو گدھا پیشاب کر رہا ہے" لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ "گدھے" پھر بھی باز نہیں آتے، البتہ کچھ دنوں سے ہم اس نوع کی دیواروں پر ایک نئی عبارت دیکھ رہے ہیں جو خاصی موثر ثابت ہو رہی ہے حالانکہ اس عبارت میں نہ تو "منع ہے" قسم کی کوئی چیز درج ہے اور نہ ہی کسی کو گدھا کہا گیا ہے بلکہ صرف اتنا لکھا گیا ہے کہ "اس طرف قبلہ ہے" نتیجہ یہ کہ اس دیوار کے نیچے ہم نے کوئی مائع قسم کی چیز سانپ جیسی لکیروں کی صورت میں نہیں دیکھی

البتہ ایک روز ایک نوجوان کو ایسی دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑا دیکھا تو حیرت ہوئی جب وہ فارغ ہوا تو ہم نے پوچھا "میاں! یہ کیا ؟" کہنے لگا "کچھ بھی نہیں، میں نے تحقیق کر لی ہے قبلہ اس طرف نہیں ہے"

چونکہ اب پہلے سے زیادہ سنگین مسائل پیدا ہو چکے ہیں چنانچہ ان دیواروں پر سے پہلی عبارتیں مٹا کر نئی عبارتیں درج کرنی چاہئیں جن میں عوام کو سختی سے ان چیزوں سے منع کیا گیا ہو جو واضح طور پر ناپسندیدہ ہیں۔ مثلاً ہمارے نزدیک اختلاف کرنا ایک ناپسندیدہ فعل ہے کیوں کہ اس سے معاشرے میں انتشار پیدا ہوتا ہے یہ صرف ہماری رائے نہیں بلکہ ملک کے ممتاز دانشور، سیاسی فلاسفر اور قومی راہنما بھی ان دنوں یہی کہتے ہیں چنانچہ انہوں نے ایک عرصے سے اختلاف کرنا چھوڑ رکھا ہے بلکہ ان میں بیشتر تو ایک ایک کرکے حزبِ اختلاف کو چھوڑتے چلے جا رہے ہیں تاہم اس کے باوجود ہمارے درمیان ایک محدود سا طبقہ موجود ہے جو اختلاف کرنے سے باز نہیں آتا اور جہاں کھڑا ہوتا ہے وہاں اختلاف کرنا شروع کر دیتا ہے ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کے لیے ضروری ہے کہ جگہ جگہ "یہاں اختلاف کرنا منع ہے" کی تختیاں آویزاں کی جائیں اگر یہ لوگ اس کے باوجود اپنی اس حرکت سے باز نہ آئیں تو دیواروں پر گدھے کی تصویر بنائی جائے اور نیچے لکھا جائے کہ "دیکھو! گدھا اختلاف کر رہا ہے"! ممکن ہے اس حربے کے باوجود یہ لوگ اپنی مخالفانہ ذہنیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اختلاف کے ذریعے معاشرے میں انتشار پھیلانے کی پریکٹس جاری رکھیں اگر ایسا ہو تو پھر آخری حربے کے طور پر جگہ جگہ یہ عبارت درج کی جائے "یہاں قبلہ و کعبہ تشریف رکھتے ہیں، براہ کرم ان کے سامنے بحث و تمحیص سے گریز کریں"۔ ہمیں یقین ہے کہ اس طریق سے ان کی زبانوں کو لگام پڑ جائے گی، کیونکہ ہماری قوم کے گنہگار ترین افراد بھی مذہبی حوالے کا کچھ نہ کچھ احترام ضرور کرتے ہیں چنانچہ ہمیں توقع ہے کہ اس حوالے کی موجودگی میں یہ لوگ اختلاف کرنا چھوڑ دینگے تاہم یہ خدشہ اپنی جگہ موجود ہے کہ کسی ایسی ہی جگہ پر کوئی سرپھرا شخص کھڑا اختلاف کر رہا ہو اور کوئی اس سے پوچھ بیٹھے کہ "میاں! یہ کیا ؟" تو وہ آگے سے دانت نکال کر کہے "میں نے تحقیق کر لی ہے، یہاں کوئی قبلہ و کعبہ ایسے نہیں ہیں جن سے اختلاف نہ کیا جا سکے"!

۱۹ اپریل ۱۹۷۶ء

واپس لے جائیں

ہم کل سے بہت پریشان ہیں اور پریشانی کی وجہ وہ چند کاغذات اور چٹیں وغیرہ ہیں جو ہماری مختلف جیبوں سے برآمد ہوئی ہیں۔ بظاہر اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں مگر ہم نے اس لئے بھی پریشان ہونا مناسب سمجھا کہ بہت دنوں سے کسی مسئلہ پر پریشان نہیں ہوئے تھے یہ چٹیں خاصی مختلف قسم کی ہیں اور الجھن کی وجہ یہ ہے کہ ان کا حدود اربعہ اور محلِ وقوع وغیرہ ذہن میں نہیں آ رہا۔ مثلاً ایک چٹ پر ۸۱۸۲ لکھا ہے۔ پریشان ہم اس لیے ہیں کہ "اکیاسی بیاسی" کی گنتی کی نوبت سکول کے دور میں آتی ہے تاہم ذہن پر ذرا زور ڈالنے سے ہمیں یاد آیا کہ یہ ہندسے گنتی کے لیے نہیں لکھے گئے تھے بلکہ یہ کسی عزیز کا رول نمبر ہے جو اس نے ہمیں اپنا رزلٹ جاننے کے لیے لکھوایا تھا اب اس ضمن میں ہمیں اگر الجھن ہے تو یہ کہ وہ عزیز کون ہے؟ بہت سوچ چکے ہیں مگر اس کا نام ذہن میں نہیں آ رہا۔ اسی طرح ایک چٹ پر "بسلامت روی" لکھا ہوا ہے ہم نے متعدد بار اپنے چند بے راہرو دوستوں کو ٹرین پر چڑھاتے ہوئے "بسلامت روی" کہا ہے بلکہ کئی ایک کو "باز آئی" بھی کہا ہے مگر وہ باز نہیں آتے۔ لیکن ان الفاظ کا جیب میں سے برآمد ہونا ناقابلِ فہم ہے سوچ سوچ کر ہمیں صرف اتنا یاد آیا ہے کہ ایک دوست بہت عرصے سے کرنل محمد خاں کی کتاب "بسلامت روی" پڑھنے کے لیے مانگ رہے ہیں ہم نے متعدد بار ان سے وعدہ کیا مگر ہر بار حافظے کی کمزوری کا بہانہ بنا کر ٹال گئے۔ اس پر انہوں نے کتاب کا نام لکھ کر ہماری جیب میں ڈال دیا مگر اپنا نام لکھنا بھول گئے اب ہمیں یاد نہیں آ رہا کہ یہ دوست کون ہیں کیوں کہ یہ وعدہ تو ہم نے کئی اور دوستوں سے بھی

کیا ہوا ہے۔

ان چٹوں کے علاوہ ایک ایسی چٹ بھی ہماری جیب سے برآمد ہوئی ہے جس نے ہمیں بطور خاص بہت پریشان کیا ہے یہ کسی گھر کا ایڈریس ہے بلکہ اس کے ساتھ پورا نقشہ بھی بنا ہوا ہے ہم یہ چٹ سامنے رکھ کر گھنٹوں سوچتے رہے کہ یہ کس کا گھر ہے؟ جب کچھ پلے نہ پڑا اور یہ الجھن سر درد میں تبدیل ہو گئی تو ہم نے جھنجلاہٹ کے عالم میں سکوٹر سٹارٹ کیا اور نقشے کی پیروی کرتے ہوئے بالآخر ایک گھر کے سامنے جا کھڑے ہو گئے۔ تحقیق و تفتیش کی تو پتہ چلا کہ یہاں پاگل کتوں کے کاٹے کا شرطیہ علاج ہوتا ہے اب خدا جانے اس چٹ کے ہماری جیب سے برآمد ہونے کا کیا جواز ہے۔ اس طرح کی ایک اور چٹ بھی ہماری جیب سے نکلی ہے اس پر صرف "خادم حسین" لکھا ہوا ہے اب اللہ جانے یہ "خادم حسین" کون صاحب ہیں، کیونکہ ہمارے ہاں تو ایک سے ایک "خادم" پڑا ہوا ہے جس میں "خادم قوم" اور "خادم ملت" وغیرہ بھی شامل ہیں۔

تاہم ایک چٹ ایسی بھی ہماری جیب سے برآمد ہوئی ہے جو ہماری خصوصی توجہ کا باعث بنی ہوئی ہے یہ ۳۸۴۰۳۸ کے ہندسے پر مشتمل ہے ہم نے اس کے بارے میں خود بھی بہت سوچا ہے دوستوں سے بھی راہنمائی حاصل کی ہے مگر ابھی تک مشکل کشائی نہیں ہو سکی ہم نے سوچا ممکن ہے یہ کسی دوست کا ٹیلیفون نمبر ہو اور اس کا نام ہمارے ذہن سے اتر گیا ہو سو اپنا یہ شبہ دور کرنے کے لیے ہم نے اس نمبر پر رنگ کیا تو کسی عبدالغفور صاحب نے فون اٹھایا اور واضح رہے کہ ہم کسی عبدالغفور کو نہیں جانتے ایک خیال ہمارے ذہن میں یہ بھی آیا کہ ممکن ہے یہ ہندسے لکھتے ہوئے ہم بیچ میں ڈیش (۳۸-۴۰-۳۸) ڈالنا بھول بھول گئے ہوں مگر اس صورت میں تو یہ خاصی مخرب اخلاق چیز معلوم ہوتی ہے سو ہم خاصی بھول بھلیوں میں پڑ گئے ہیں لہٰذا تمام احباب سے مخلصانہ درخواست ہے کہ وہ ان چٹوں کے سلسلے میں ہماری راہنمائی فرمائیں بصورت دیگر اولین فرصت میں اپنی چیزیں واپس لے جائیں۔

۱۳ر مئی ۱۹۷۶ء

بے شرم

وزیر آباد سے چند میل ادھر موضع دھونکل کے ریلوے سٹیشن پر تیز گام کو کراسنگ کی وجہ سے رکنا پڑا ۔ چلچلاتی دوپہر میں پلیٹ فارم کا بے سایہ پتھریلا فرش شعلے اگل رہا تھا پلیٹ فارم کے مین گیٹ سے دھونکل کا قصبہ دکھائی دے رہا تھا ایک ٹوٹے پھوٹے پتھروں والی سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی دور تک چلی گئی تھی ۔ سڑک کے دائیں طرف ایک چھوٹی سی مسجد کے مینار دکھائی دے رہے تھے مسجد کی دیوار کے ساتھ ایک بھینس بندھی تھی کچھ پختہ اور کچھ مٹی کے مکان بھی نظروں کے سامنے تھے جن کی دیواروں پر سگھڑ گرہستنوں نے پاتھیاں (اوپلے) تھوپی ہوئی تھیں ۔ پلیٹ فارم پر ہُو کا عالم تھا ایک گھنے درخت کے نیچے پانی کا نلکا تھا اور ریلوے کا ایک ملازم لنگوٹ باندھے وہاں نہانے میں مصروف تھا ۔ گاڑی سٹیشن پر رکی تو گرمی سے بے حال مسافروں کا ہجوم پیپڑی جمے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا پانی کی تلاش میں پلیٹ فارم پر بکھر گیا ۔

پلیٹ فارم کے ایک کونے میں لکڑی کے بنے ہوئے ایک ڈھانچے میں پانی کا گھڑا دھرا تھا ۔ کچھ مسافر اس طرف لپکے لیکن وہاں گلاس نہ پا کر مایوسی کے عالم میں کسی "صاحبِ گلاس" کا انتظار کرنے لگے اتنے میں ایک منچلے نے گھڑے کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور پھر منہ کے ساتھ لگا کر غٹاغٹ پانی پینے لگا ۔ باقی لوگ نلکے کی طرف چلے گئے تھے اور اب وہاں ایک اچھا خاصا ہجوم جمع ہو گیا تھا ریلوے کے ملازم نے اپنے منہ اور جسم پر صابن ملا ہوا تھا اور ابھی وہ اسے دھونے کی فکر میں تھا کہ ایک پیاسے نے نلکے کے ساتھ منہ لگایا اور اپنی پیاس بجھانے میں مشغول ہو گیا ۔ نہانے والے نے جھنجلاہٹ کے عالم

میں آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں صابن اس کی آنکھوں میں چلا گیا اور اس نے آنکھیں دھونے کے لیے دونوں ہتھیلیاں یکجا کر کے نلکے کے آگے پھیلا دیں لیکن اتنی دیر میں کوئی دوسرا شخص نلکے کے ساتھ منہ لگا چکا تھا نہانے والے نے سخت اضطراب کے عالم میں کچھ دیر انتظار کیا اور پھر فرش پر پانی کے قطروں کی "ٹاپ" سن کر ایک بار پھر ہاتھ نلکے کی طرف پھیلا دیئے لیکن اتنی دیر میں ایک اور پیاسا نلکے کے ساتھ "بوس و کنار" میں مشغول ہو چکا تھا صابن ریلوے کے ملازم کی آنکھوں میں اترتا چلا جا رہا تھا اور اب اس کی بے چینی نکتۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔

" ذرا ایک منٹ کے لیے رک جاؤ، میں جسم پر سے صابن اتار لوں۔"

اس نے پیاسوں سے اپیل کی۔ صابن اس کے جسم پر جمنا شروع ہو گیا تھا اور آنکھوں میں سوئیاں سی چبھنے کے ساتھ ساتھ جسم پر خارش بھی شروع ہو گئی تھی

" بادشاہو! جی بھر کے صابن اتارو، ہم تو ریلوے والوں کے خادم ہیں۔" ایک مسافر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اظہار نیاز مندی کیا۔ لیکن جتنی دیر میں نہانے والے نے نلکے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ نیاز مند ٹونٹی کو فیڈر کی طرح منہ میں لے چکا تھا۔

" تہاڈا بیڑہ غرق"، نہانے والے نے اپنے دلی جذبات کا اظہار مہذب ترین لفظوں میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا" خدا کے لیے ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔ مجھے آنکھوں میں سے صابن نکالنے دو۔ میری آنکھیں جل رہی ہیں۔"

" تمہاری آنکھیں جل رہی ہیں تو ہماری زبانیں جل رہی ہیں تم تو تھوڑی دیر بعد جی بھر کے نہا لو گے۔ ہمیں ہونٹ تر کرنے کے لیے بھی طویل عرصہ انتظار کرنا پڑے گا" ایک پیاسے نے اپنا نکتۂ نظر پیش کیا اور "بُک" سے پانی پینے میں مشغول ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا مسافر آگے بڑھا پھر تیسرا اور ایک بار پھر لائن لگ گئی۔

اتنی دیر میں دوسری طرف سے آنے والی ٹرین کی وسل سنائی دی۔ جس کا مطلب تھا کہ پلیٹ فارم پر کھڑی گاڑی چند لمحوں میں چلنے والی ہے۔ اس پر پیاسوں میں بھگدڑ مچ گئی اور اب وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے پانی پینے کی تگ و دو کر رہے تھے آنکھوں سے صابن نکالنے کے لئے بے چین ریلوے ملازم اب گالیوں پر اتر آیا تھا۔ لیکن پیاسے اس پر بھی بے مزہ نہیں ہوئے تھے اور یکے بعد دیگرے ٹونٹی کے ساتھ

منہ لگاتے چلے جاتے تھے حتیٰ کہ دوسری طرف سے آنے والی ٹرین ایک زناٹے کے ساتھ پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور طوفان کی طرح گزر گئی۔ پلیٹ فارم پر کھڑی تیز گام نے بھی وسل دیا اور پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے سرکنے لگی جو پیاسے ہونٹ گیلے کرنے سے رہ گئے تھے انہوں نے پانی کا خیال چھوڑا اور لپک لپک کر ٹرین پر سوار ہونے لگے ، ان میں سے ایک نے گیٹ کے ساتھ لٹکتے ہوئے ریلوے کے "نابینا" ملازم کو مخاطب کیا اور دانت نکالتے ہوئے حلق کی پوری قوت سے چیخ کر کہا:۔

"تسیں نہالئو ساڈی خیر اے"! (تم نہالو ہماری خیر ہے) یہ سن کر اس دل جلے نوجوان نے جلدی سے آنکھوں پر پانی کا چھینٹا مارا اور پھر اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر خاموشی سے لنگوٹ کی "نشست" تبدیل کر دی اس کا منہ ٹرین کی طرف تھا اور اس کے حریف مسافروں سے بھری ہوئی بوگیاں ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے گزرتی جا رہی تھیں

۷ر جون ۱۹۷۶ء

ـــــــــ یک چشم گل

اسمبلی میں کانوں کی نمائندگی بھی ضرور ہونی چاہیئے ان کی اہمیت کا اندازہ آپ اس محاورے سے لگا سکتے ہیں جس کیمطابق اندھوں میں کانا راجا ہوتا ہے کانا ـــــــ وہ ہوتا ہے جس کی صرف ایک آنکھ ہوتی ہے چنانچہ وہ ادھورے مناظر دیکھتا ہے۔ اگر وہ بائیں ہاتھ سے کانا ہے تو اسے دائیں ہاتھ کی خوبصورتیاں نظر نہیں آتیں اور اگر وہ دائیں ہاتھ سے کانا ہے تو بائیں ہاتھ کا حسن اس کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔

۱۹ر جنوری ۱۹۷۷ء

آواز نہیں آ رہی !

کسی دوسرے شہر میں مقیم ایک نوجوان نے اپنے والد کو فون کیا اور سلام دُعا کے بعد پوچھا "گھر کا کیا حال ہے ؟"

"سب ٹھیک ٹھاک ہیں !" والد نے جواب دیا۔

"کاروبار کیسا چل رہا ہے ؟"

"اللہ کا شکر ہے !"

"میں نے فون اس لئے کیا تھا کہ ہاسٹل کے اخراجات وغیرہ کے لیے پانچ سو روپے درکار ہیں۔ اگر جلدی بھیج دیں تو مہربانی ہو گی۔" بیٹے نے اظہار مدعا کیا۔

"آواز نہیں آ رہی !" دوسری طرف سے والد نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے عرض کیا ہے کہ مجھے پانچ سو روپے فوری طور پر درکار ہیں !"

آواز نہیں آ رہی !" والد نے مزید اونچی آواز میں بولتے ہوئے کہا۔

"مجھے پانچ سو روپوں کی ضرورت ہے" بیٹے نے حلق کی پوری قوت سے چیخ کر اپنی آواز والد کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کی !

"بیٹے ! آواز نہیں آ رہی !"

اس پر ٹیلی فون آپریٹر بیچ میں بول پڑا "شیخ صاحب ! اگر مجھے آپ کے بیٹے کی آواز سنائی دے رہی ہے تو آپ کو کیسے سنائی نہیں دے رہی ؟"

اس پر شیخ صاحب نے کہا "اگر تمہیں آواز سنائی دے رہی ہے تو پھر پانچ سو روپے پلے سے دے دو!"

کچھ اسی طرح کی ایک ٹرنک کال گزشتہ دِنوں ہم نے بھی سنی ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

"ہیلو شیخ رشید صاحب، میں ڈاکٹر مبشر حسن بول رہا ہوں!"

"کیا حال ہیں ڈاکٹر صاحب؟"

"بالکل ٹھیک ہوں، آپ سنایئے!"

"میں بھی خیریت سے ہوں، پارٹی کی صورتِ حال سے کچھ دِل برداشتہ سا تھا، سوچا آپ سے بات کر کے دِل کا بوجھ ہلکا کروں!"

"جی ہاں! ہم لوگ تو اس لیے پارٹی میں شامل ہوئے تھے کہ ملک سے سرمایہ داری اور جاگیرداری کا نام و نشان مٹا دیں گے، لیکن سرمایہ دار اور جاگیردار تو پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتے چلے جا رہے ہیں!"

"شیخ صاحب! یہی نہیں بلکہ جو شخص انقلاب کا نام لے اسے برسرِعام جھاڑ پلا دی جاتی ہے!"

"جی ہاں! یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ استعفٰے کیوں نہیں دے دیتے؟"

"شیخ صاحب! آواز نہیں آرہی۔ میں یہ عرض کرنے والا تھا کہ آپ اگر مناسب سمجھیں تو استعفیٰ دے دیں"

"ڈاکٹر صاحب! آواز نہیں آرہی۔ میں یہ عرض کرنے والا تھا کہ اس صورتِ حال میں آپ کو مستعفی ہو جانا چاہیئے"

"شیخ صاحب، آواز نہیں آرہی۔ اگر ہو سکے تو آپ استعفےٰ دے ڈالیں!"

"ڈاکٹر صاحب آواز...."

"شیخ صاحب آواز...."

۱۱ر جون ۱۹۷۶ء

انکل جیری

میں نے اپنا سامان سمیٹا اور کراچی سے واپس لاہور آنے کے لیے لارنس روڈ پر واقع مہر آباد بلڈنگ کا فلیٹ نمبر ۷ چھوڑنے ہی کو تھا کہ دروازے پر گھنٹی ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک ہونّق سا امریکی نوجوان کھڑا تھا۔ قدرے لمبوترا چہرہ، سر پر خشخشی بال، پورے منہ میں صرف سات دانت، تین اوپر چار نیچے، اوپر کے تین دانتوں میں سے درمیانی دانت سیاہ پڑ چکا تھا اور اب وہ بھی جھڑنے والا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی پتلون اور میرون کلر کی دھاری دار قمیض پہنی ہوئی تھی۔

"سالاما لیکم! مجھے انکل جیری کہتے ہیں۔ میں سیدھا نیویارک سے آرہا ہوں۔ مجھے موبین پیرزیدہ (مبین پیرزادہ) سے ملنا ہے!" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور پھر چار نیچے اور تین اوپر والے دانت نکال کر ہنسنا شروع کر دیا۔

میں نے ایک نظر اس لغلول کو دیکھا اور بیشتر اس کے کہ اسے کوئی جواب دیتا وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے لگا۔

"مبین یہاں نہیں ہے" میں نے دروازے کے درمیان میں کھڑا ہو کر راستہ بند کرتے ہوئے کہا۔ کمرے میں میری اہلیہ چیزیں سمیٹنے میں مشغول تھی اور وہ اس مخلوق کو اچانک سامنے پا کر ڈر جاتی۔

"آؤؤؤ" اس کے چہرے پر سخت پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے "کیا وہ بتا کر نہیں گیا کہ

وہ کہاں جارہا ہے ؟"

" وہ گزشتہ شام کو اپنے والدین کے پاس حیدر آباد چلا گیا تھا اور حیدر آباد یہاں سے سوا سو میل ہے "

" آؤ ہو ؤ " ایک بار پھر اس کے حلق سے یہ عجیب و غریب آواز نکلی " کیا میں ٹیلی فون پر اس سے بات کرسکتا ہوں ؟"

" ایک منٹ ٹھہر جاؤ " میں نے اسے تھوڑی دیر کے لئے دروازے پر روکا اور پھر اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے آیا۔ میں نے مبین کا نمبر ملایا تو اتفاق سے وہ گھر پر ہی موجود تھا " تمہارا ایک دوست جیری نیویارک سے تمہیں ملنے کے لیے آیا ہے اور وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔

" ہے " (HAY) جیری نے مجھے شانوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "جیری نہیں ، انکل جیری کہو "

" انکل جیری " میں نے مبین کو تصحیح شدہ پیغام پہنچایا اور ساتھ ہی ریسیور جیری کو تھما دیا۔ تھوڑی دیر گفتگو کے بعد جیری نے ریسور واپس رکھ دیا۔ وہ اب خوش نظر آرہا تھا " مو بین کہتا ہے کہ میرے ماموں ابھی لاہور واپس جارہے ہیں تم ان کے ساتھ ٹرین میں آجاؤ۔ میں تمہیں حیدر آباد اسٹیشن پر اتار لوں گا۔"

لارنس روڈ سے اسٹیشن تک جاتے ہوئے جیری نے ٹیکسی کی کھڑکی میں سے اپنا سر باہر نکالا ہوا تھا اور دھڑا دھڑ گدھا گاڑیوں اور خستہ حال بسوں سے چمگادڑوں کی طرح چمٹے ہوئے لوگوں کی تصویریں اتارنے میں مشغول تھا۔ ایک جگہ اس نے اچانک چلانا شروع کردیا " روکو۔ روکو۔" ٹیکسی ڈرائیور نے گھبرا کر ایک دم بریکیں لگائیں جس سے حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا

" اسے کہو کہ گاڑی ذرا پیچھے لے جائے " جیری نے میری وساطت سے ٹیکسی ڈرائیور کو گاڑی ریورس کرنے کے لیے کہا اور پھر اسے واپس اسی جگہ لے آیا جہاں ایک اونٹ گاڑی کھڑی تھی اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور پھر مجھے بھی اترنے کو کہا اس کے چہرے سے جوش و خروش چھلک رہا تھا۔

" میں اونٹ پر بیٹھتا ہوں ، تم میری تصویر اتارو " اس نے مجھے کیمرہ تھماتے ہوئے کہا۔

" اندر ٹیکسی میں بیٹھو" میں نے جھلا کر کہا "سارا ٹریفک جام ہو گیا ہے تم یہ تصویر کسی اور موقع پر بھی لے سکتے ہو۔"

" آڈوڈو " اس بار اس کی طرف سے یہ تاسف کا اظہار تھا اور پھر وہ اونٹ پر ایک حسرت بھری نظر ڈالتا ہوا واپس ٹیکسی میں بیٹھ گیا

" وہ دیکھو۔ وہ دیکھو" اس نے چلتی ٹیکسی میں سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر "ٹک" سے تصویر لے لی۔ میں نے اس طرف دیکھا تو پام کے درختوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

" پام کے درخت تو صرف ہوائی میں ہوتے ہیں۔ کیا تم لوگ اس کی پنیری وہاں سے منگوا کر یہاں کاشت کرتے ہو؟"

یہ خالص امریکی ذہنیت کا سوال تھا سو میں نے اس کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اس اثنا میں ٹیکسی ریلوے اسٹیشن پہنچ چکی تھی۔ قلی نے سامان اٹھایا اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے سر پر رکھ لیا۔

" اس نے سامان سر پر کیوں رکھا ہے ہاتھ میں کیوں نہیں اٹھاتا؟"

" اس لیے کہ اس کے ہاتھ صرف دو ہیں جب کہ صندوق چار ہیں" میں نے جھلائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

" آڈوڈو" جیسے یہ بات اس کی سمجھ آ گئی تھی۔

اب ہم اپنی سیٹوں پر براجمان ہو گئے تھے۔

" ہے" جیری نے مجھے مخاطب کرنے کے لیے آواز نکالی

" میرا نام "ہے" نہیں، عطا ہے ویسے کیا بات ہے؟"

" ادھر دیکھو" اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ کس قدر خوبصورت پرندہ ہے، اس کا کیا نام ہے؟"

" اس خوبصورت پرندے کا نام کوّا ہے" میں نے جل کر کہا

" یہ کوّا نہیں ہے"۔

" تو پھر کیا ہے؟"

"یہی تو تم سے پوچھ رہا ہوں" جیری نے کہا۔

"تو پھر مجھ پر اعتبار کر لو یہ کوا ہی ہے اور ہمارے ہاں اس کا شمار خوبصورت پرندوں میں نہیں ہوتا"۔

"اگر یہ کوا ہے تو بھی کس قدر خوبصورت ہے، او گاڈ ہمارے ہاں اس طرح کے کوے نہیں ہوتے کیا میں یہ پکڑ سکتا ہوں؟"

"کوشش کر دیکھو" میں نے اکتا کر کہا "ویسے اس کے حسن کے بارے میں جو کلمات تم نے میرے سامنے کہے ہیں اگر اس کے کان میں کہہ دو تو وہ رضاکارانہ طور پر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے گا"۔

اتنی دیر میں کوا اڈاری مار کر دوسرے پلیٹ فارم کی طرف نکل گیا تھا اس بار جیری نے حسرت بھری نظر کوے پر ڈالی اور پھر چار نیچے اور تین اوپر والے دانت نکال کر ہنسنے لگا

"ہے، ہے" اس نے ایک بار پھر مجھے مخاطب کیا

"ہے، ہے" نہیں "عطا" میں نے ایک بار پھر اسے ٹوکا

"آتا"؟

"نہیں، "ہے ہے" ہی ٹھیک ہے!"

"یہ دیکھو! بچہ ننگا ہے، اس کے جسم پر کپڑے نہیں ہیں" اس نے پلیٹ فارم پر کھڑکی کے برابر میں کھڑی پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک آٹھ دس سالہ بچی کی طرف اشارہ کیا، جس نے گود میں ایک زرد مریل سا بچہ اٹھایا ہوا تھا۔ جیری کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں "یہ بچہ ننگا کیوں ہے؟ اس لڑکی کے پاؤں میں جوتے کیوں نہیں؟ یہ ہاتھ پھیلا کر مجھ سے کیا مانگ رہی ہے؟" ان سوالوں کا راستہ روکنے کے لیے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا، میں نے ایک سکہ نکالا اور بچی کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ لڑکی آگے بڑھ گئی اور اس نے برابر والی کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے مسافروں کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

گاڑی چلنے والی تھی۔ جیری کھڑکی میں سے سر نکالے ہر آنے جانے والے کو "سالاما لیکم" کہتا تھا اور پھر اپنے گنتی کے دانتوں کی نمائش لگا دیتا تھا، یہ اس کی طرف سے غالباً خوش اخلاقی

کا مظاہرہ تھا، ایک آوارہ کتا پلیٹ فارم پر پھر رہا تھا، چلتے چلتے وہ ایک جگہ رک گیا اور پھر تھوتھنی اٹھا کر جیری کی طرف دیکھنے لگا۔

"آؤ ؤ ؤ" اور اس بار یہ آواز کتے نے نکالی تھی!

گاڑی چل پڑی تھی مگر جیری کی عجیب وغریب حرکات اسی طرح جاری تھیں

"مجھے آدھے چہرے کو نقاب میں رکھنے والی عورتیں بہت اچھی لگتی ہیں، سامنے بیٹھی ہوئی عورت سے کہو کہ وہ اپنے چہرے کو آنکھوں سے نیچے تک نقاب سے ڈھانپ دے، میں اس کی تصویر لینا چاہتا ہوں" جیری نے کیمرے کا رخ عورت کی طرف کرتے ہوئے مجھ سے فرمائش کی۔ عورت نے کیمرے کا رخ اپنی طرف دیکھا تو جھنیپ کر نقاب چہرے پر گرا لیا اور منہ دوسری طرف کر کے بیٹھ گئی۔

"ہے، اس نے منہ کیوں پھیر لیا ہے؟"

"ابھی تو اس نے صرف منہ پھیرا ہے، اگر تم نے اپنی یہ حرکتیں جاری رکھیں تو وہ سینڈل اتار لے گی۔"

"مگر کیوں؟" اس نے حیرت سے چیخ کر کہا۔

"میرے پاس اس کیوں کا جواب نہیں ہے، اس کے لیے تمہیں کچھ عرصہ یہاں رہنا پڑے گا۔ ویسے یہ بتاؤ تم میین کو کس طرح جانتے ہو؟"

"میں نیو یارک کی بندرگاہ پر جہازوں میں تبلیغ کے لیے جایا کرتا تھا، میین وہیں میرا دوست بنا تھا!"

"تو کیا تم مبلغ ہو؟" میں نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے پوچھا

"ہاں میں خدا کا پیغام رساں ہوں!" اس نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تم عیسائیوں کے کس فرقے سے تعلق رکھتے ہو؟"

"میں کسی فرقے سے تعلق نہیں رکھتا، میں سچا عیسائی ہوں۔"

"مگر تم کسی چرچ سے تو وابستہ ہو گے؟"

"ہاں میرا تعلق "یہوواز وٹ نیس" (JEHOVA'S WITNESS) سے ہے اور صرف

یہی ایک سچائی کا راستہ ہے۔"

"تبلیغ کے علاوہ تمہارا کیا مشغلہ ہے"؟ میں نے پوچھا

"میں کوڈک کمپنی میں کام کرتا ہوں"!

"پوریاں ای پاناں ہودیں گا" میں نے ہنستے ہوئے پنجابی میں کہا۔ دراصل ابھی تک اس کی کوئی بات میرے پلے نہیں پڑی تھی۔ کم ازکم ایک آدھ میری بات بھی اسے سمجھ میں نہیں آنا چاہیئے تھا!

اس دوران باتیں کرتے کرتے جیری نے اچانک دائیں ہاتھ کی سیٹ پر بیٹھے میرے ڈھائی سالہ بیٹے یاسر کو متوجہ کرنے کے لیے انگوٹھے کے برابر والی دو انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے "ہُوہُو" کی آواز نکالی اور پھر ہنسنا شروع ہو گیا۔

"اس کا نام کیا ہے"؟ جیری نے ایک جرک کے ساتھ اپنی ہنسی روکی اور پوچھا

"یاسر" میں نے جواب دیا۔

"آڈُوڈُ" اس بار اس نے حقارت کے اظہار کے لیے یہ آواز نکالی "مجھے یہ نام اچھا نہیں لگتا"!

"کیوں"؟ میں نے حیرت سے پوچھا

"مجھے قتل و غارت گری سے نفرت ہے اور یاسر عرفات کا یہی مشغلہ ہے"!

"تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیئے" میں نے غصّے سے کہا۔ "مظلوموں کو اپنا غصب شدہ حق واپس لینے کے لیے تلوار اٹھانا ہی پڑتی ہے"۔

"نہیں یہ مسئلہ کا حل نہیں ہے" جیری نے کہا "انہیں چاہیئے کہ وہ یہوواسے مدد چاہیں، وہ خود مظلوموں کی مدد کو پہنچے گا" اور وہ ایک بار پھر ہنسنا شروع ہو گیا۔

"یہ تمہارے دانتوں کو کیا ہوا ہے"؟ ہنسنے کے دوران اس کے دانتوں پر پھر میری نظر پڑ گئی تھی۔

"پتہ نہیں کیا ہوا ہے"۔ اس نے لاپرواہی سے کھڑکی سے باہر سر نکال لیا۔

"تم ان کا علاج کیوں نہیں کراتے"؟

" ڈاکٹر میرے دانت واپس نہیں دلا سکتے، یہوواہ مجھے پہلے سے بہتر دانت دے گا"
مجھے جیری سے کچھ ہمدردی سی پیدا ہو گئی تھی، اور اب میں اس کی ذات میں دلچسپی لینے لگا تھا

" تم تنہا رہتے ہو یا اپنے والدین کے ساتھ رہائش پذیر ہو؟" میں نے پوچھا۔

" میں تنہا ہوں۔ میرے بچپن ہی میں میرا باپ کثرتِ شراب نوشی سے چل بسا تھا، کچھ عرصہ بعد ماں بھی مر گئی اب ایک بہن ہے مگر میں نے گزشتہ دس برس سے اس کی شکل نہیں دیکھی"۔

" وہ کیوں؟"

اس نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی تھی۔ وہ منی سکرٹ پہنتی تھی، سگریٹ پیتی تھی، شراب نوشی کرتی تھی اور اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ نائٹ کلبوں اور دوسری بُری بُری جگہوں پر جاتی تھی میں اس کی شکل دیکھنا پسند نہیں کرتا"۔

" تو کیا تمہارے مذہب میں یہ سب چیزیں گناہ ہیں؟"

" ہاں شادی سے پہلے ہم کسی عورت کا بازو بھی نہیں تھام سکتے۔ میں جن لوگوں کے درمیان رہتا ہوں وہ سچے عیسائی نہیں ہیں"۔

" تمہاری شادی ہو گئی ہے؟" میں نے اچانک پوچھا۔

" نہیں" اس کی آواز میں غم کی لرزش تھی۔

" تم اپنی تنہائیاں دور کرنے کے لیے شادی کیوں نہیں کر لیتے کیا اس میں کسی قسم کی مذہبی رکاوٹ ہے؟" میری دلچسپی اس میں بڑھتی جا رہی تھی!

" نہیں اس کی کچھ ذاتی وجوہ ہیں" جیری نے ڈوبتی آواز میں کہا " لیکن مجھے شادی کی ضرورت نہیں ہے مجھ سے سب چھوٹے بڑے محبت کرتے ہیں۔ میں ان میں بہت مقبول ہوں وہ مجھے انکل جیری کہتے ہیں!" یہ کہتے ہوئے اچانک جیری نے ایک بار پھر یاسر کو متوجہ کرنے کے لیے اپنی دو انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے " ہو، ہو" کی آواز نکالی اور پھر اس کے ساتھ ہی بے تحاشا ہنسنے لگا۔

گاڑی اپنی پوری رفتار سے فراٹے بھرتی ہوئی حیدر آباد کی طرف جا رہی تھی کسی گھنے سائے سے محروم بنجر اور بے رفاقت زمینوں میں کیکٹس کے پودے ایک دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے انجن نے ایک دلدوز چیخ ماری اور پھر انکل جیری کی ہنسی اس چیخ میں تحلیل ہوتی چلی گئی!

۲۶ ر اگست ۱۹۷۶ء

شعر دان

افلاطون نے اپنی مثالی ریاست کے تصور میں سے شاعروں کو خارج کر دیا تھا ہمیں یقین ہے کہ افلاطون کو شاعری سے کوئی کد نہ تھی بلکہ شاعروں کے "عرض کیا ہے" والے رویے سے تنگ آ کر اس نے انہیں ایک ناکارہ مخلوق قرار دے دیا تھا کیونکہ شاعری کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جس سے کسی اہل ذوق کا "اِٹ کھڑکا" رہتا ہو۔ البتہ اس سطحِ ارضی پر شاعروں کی ایک ایسی قسم ضرور موجود ہے جس کے "شر" سے لوگ پناہ مانگتے ہیں اور یہ قسم وہی ہے جو جہاں بیٹھتی ہے شعر اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاں دیوار و در کو پان کی پچکاریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اگالدان استعمال میں لائے جاتے ہیں وہاں "شعر دان" قسم کی کوئی چیز بھی ایجاد ہونا چاہیئے تا کہ جہاں کسی شاعر کو شعر اگلنے کی ضرورت محسوس ہو یہ "شعر دان" اس کے آگے کر دیا جائے

۲۲ ر اگست ۱۹۷۶ء

طوطے اے طوطے

گزشتہ دنوں میں نے بازار میں لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا جو ایک جگہ جمع تھا میں نے آگے بڑھ کر جھانکا تو ایک طوطے فروخت کرنے والا تھا جس نے کئی پنجروں میں بہت سے طوطے قید کر رکھے تھے مگر لوگ ان طوطوں کو دیکھنے کے لیے یہاں جمع نہ تھے بلکہ ان کی دلچسپی کا مرکز وہ شخص تھا جس نے بھاری قیمت ادا کر کے وہ تمام طوطے خرید لیے تھے اور اب انہیں ایک ایک کر کے آزاد کر رہا تھا تھوڑی ہی دیر میں تمام طوطے قید سے رہا ہو چکے تھے اور اڈاری مار کر کہیں کے کہیں پہنچ چکے تھے مگر ان میں ایک طوطا ایسا بھی تھا جو اڑنے کا نام نہیں لیتا تھا، طوطوں کو آزاد کرنیوالے شخص نے اسے کئی بار ہاتھ میں پکڑ کر فضا میں اچھالا مگر وہ ہر بار آزاد اور کھُلی فضاؤں میں گم ہونے کی بجائے زمین پر واپس آجاتا اور پھر پھدک پھدک کر واپس اپنے آقا کے قدموں میں پہنچ جاتا۔ یہ غالباً "وفادار" طوطا تھا اور باقی غالباً "طوطا چشم" طوطے تھے۔

جب میں نے اس نیک دل شخص کو طوطوں کو یوں آزاد کراتے دیکھا تو میرے دل سے دعا ابھری کہ "یا خدا! مجھے بھی کچھ وسائل عطا کر میں بھی بہت سے طوطوں "کو آزاد کرانا چاہتا ہوں" اور پھر چشم تصور میں مَیں نے دیکھا کہ میری دعا قبول ہو گئی ہے اور میں ایک بہت بڑے پنجرے کے قریب کھڑا ہوں اس پنجرے میں مختلف قسم کے طوطے بند تھے ان میں سے کچھ بولنے والے تھے اور کچھ ایسے تھے جو بولتے نہیں تھے میں نے علیحدہ علیحدہ ان کی قیمت پوچھی تو دکاندار نے ان کی ایک ہی قیمت بتائی۔ میں نے حیران ہو کر اس کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا "خاموش رہنے والے طوطوں کی قیمت

اس لیے زیادہ ہے کہ وہ خاموش رہتے ہیں اور بولنے والے طوطوں کی قیمت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ بولتے ہیں۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور رقم گن کر دکاندار کی ہتھیلی پر رکھ دی اس نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا پہلے میں نے خاموش طوطوں کو باہر نکالا اور پھر انہیں ایک ایک کر کے فضا میں اچھال دیا۔ انہوں نے بازار کا ایک چکر لگایا اور پھر خاموشی سے اپنے آقا کے قدموں میں آ گئے اس کے بعد میں نے بولنے والے طوطے باہر نکالے اور انہیں فضا میں اچھال دیا۔ بازار کا چکر لگانے کے بعد وہ بھی ٹائیں ٹائیں کرتے ہوئے اپنے آقا کے قدموں میں پھدکنے لگے۔ میں نے مالک سے اس کی وجہ پوچھی تو پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا ایک بولنے والے طوطے نے سنہری لکیر والی گردن اوپر اٹھائی اور کہنے لگا "ہم بازار کا چکر لگا کر آئے ہیں سب کاروبار مندا پڑا ہے۔ روزی پنجرے کے باہر نہیں پنجرے کے اندر ہے" اور خاموش رہنے والے طوطوں نے گردن ہلا کر اس کی تصدیق کر دی

میں نے تعجب سے ایک نظر طوطوں کو اور پھر ان کے مالک کو دیکھا۔ مالک ہنس رہا تھا، طوطے بھی ہنس رہے تھے میں نے اپنی حیرت پر قابو پایا اور کہا "یہ طوطے ہم انسانوں کی باتیں سمجھتے ہیں اور ہم انسانوں کی زبان میں باتیں کرتے ہیں، یہ کیا ماجرا ہے؟" مالک نے بتایا "یہ طوطے معمولی طوطے نہیں ذہین طوطے ہیں۔ ان میں سے کچھ سیاسی طوطے ہیں، کچھ ادبی اور صحافتی طوطے ہیں، انقلابی طوطے ہیں۔ اور اسلام پسند طوطے ہیں یہ سب دانا جانور ہیں" میں نے یہ سن کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "اگر یہ اتنے ہی دانا ہیں، تو انہوں نے تمہاری غلامی کس طرح قبول کر لی ہے!" آقا نے جواب دیا "میں تو محض ان کا رکھوالا ہوں، یہ میرے غلام نہیں۔ میں تو خود غلام ہوں۔ یہ دیکھو!" یہ کہہ کر اس نے اپنی پشت پر سے کپڑا اٹھایا جس پر غلامی کا داغ موجود تھا

"تم کس کے غلام ہو؟" میں نے پوچھا

"میں جس کا غلام ہوں، وہ آگے کسی کا غلام ہے اور یہ سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے۔"

یہ سن کر میں نے اس مظلوم انسان سے ہاتھ ملایا اور واپس جانے کو تھا کہ اس نے میرے روپوں کی تھیلی مجھے لوٹا دی اور کہا "تم ضرورت مند شخص لگتے ہو، اپنے روپے واپس لے لو" میں نے ممنونیت کی نظروں سے اسے دیکھا اور پیسے جیب میں ڈال لیے

میں ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس نے ایک بار پھر مجھے پکارا۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے جیب میں سے روپوں کی ایک اور تھیلی نکالی اور مجھے تھماتے ہوئے ایک آنکھ میچ کر کہا "طوطا بنو گے؟"

۹ ر ستمبر ۱۹۷۶ء

حفظِ مراتب

ادب آداب، تکلفات اور حفظِ مراتب کے ذکر میں پولیس کا نام آنے پر قارئین یقیناً چونکے ہوں گے لیکن یہ حقیقت ہے اور ہم اس میں رتی بھر مبالغے سے کام نہیں لے رہے، اس کے ثبوت میں ہم وہ چند اعلانات یہاں درج کرتے ہیں جو ٹریفک پولیس والے ان دنوں شارع قائدِ اعظم پر لاؤڈ سپیکر وں سے نشر کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ اس سے پتہ چلے گا کہ چھوٹے بڑے کا لحاظ آج اگر کسی میں ہے تو وہ صرف پولیس میں ہے "نمونہ کلام" درج ذیل ہے۔

"نیلی ٹیوٹا والے صاحب! زحمت تو ہوگی مگر براہِ کرم اپنی گاڑی زیبرا کراسنگ سے ذرا پیچھے لے جائیں اس سے ٹریفک میں دشواری پیش آ رہی ہے، بہت نوازش شکریہ!"

"ویسپا والے صاحب! دائیں جانب مُڑنے کی کوشش نہ کریں پہلے مین روڈ کا ٹریفک گزرنے دیں اتنی بے صبری کی ضرورت نہیں۔ شکریہ!"

"اوئے سائیکل والے! اندھا ہو گیا ہے، دیکھتا نہیں اشارہ بند ہے یہ سڑک تیرے باپ کی نہیں ہے۔ دفع ہو جا! شکریہ!"

۱۵ ر نومبر ۷۶ء

کوئی واقفیت ہے؟

یوں تو بہت سے سوال ایسے ہیں جو ان دنوں بہت عام ہو گئے ہیں، چنانچہ جسے دیکھو وہ "دستِ سوال" دراز کئے نظر آتا ہے، لیکن ایک سوال تو ایسا ہے جسے پوچھنے والے جواب کی پرواہ کئے بغیر پوچھتے ہیں یعنی ؎

میں جانتا ہوں کیا وہ لکھیں گے جواب میں

والی صورت حال ہوتی ہے سوال جو پوچھا جاتا ہے، وہ یہ ہے "کوئی واقفیت ہے" اور جواب جو دیا جاتا ہے وہ "نہیں" ہوتا ہے کہ جس شخص کی جتنی واقفیت ہے، وہ اسے اپنے لیے سنبھال کر رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ "مہینے کے آخر میں" اسے دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرنا پڑے۔

کسی "واقف" کو ڈھونڈنے کی ضرورت ایک تو ان صورتوں میں محسوس ہوتی ہے جب اپنے کسی عزیز کو کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ دلانا ہو تعلیم سے فراغت کے بعد اسے نوکری کی ضرورت ہو۔ نوکری ملنے کے بعد غبن وغیرہ کا کیس ہو جائے تو معاملہ رفع دفع کرانا ہو، ٹرانسفر کرانی ہو، ٹرین کا ٹکٹ لینا ہو، اسمبلی کا ٹکٹ لینا ہو، غرضیکہ ایسے بہت سے کٹھن معاملات میں واقفیت ڈھونڈنا پڑتی ہے، لیکن کچھ کٹھن معاملات ان کے علاوہ بھی ہیں اور یہاں بھی واقفیت کے بغیر کام نہیں چلتا۔

چنانچہ گزشتہ دنوں ہمارے ایک دوست ملتان سے تشریف لائے وہ خاصے گھبرائے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "ضلع کچہری میں کوئی واقفیت ہے؟" ہم نے کہا "نہیں" مگر بات کیا ہے؟ تو بولے "زمین کی منتقلی کے سلسلے میں ایک کاغذ کی بازیابی کے لیے کلرک کو پچاس روپے نذرانے کے طور پر پیش کئے

تھے، آج چھ دن ہو گئے ہیں مگر وہ کاغذ نہیں ملا، اگر کوئی واقفیت ہو تو کلرک سے کہلوایا جائے کہ وہ برائے مہربانی ذرا جلد کام کر دے۔" ایک اور دوست نے پوچھا "بنک میں کوئی واقفیت ہے؟" ہم سمجھے شائد کوئی جعلی چیک کیش کرانا ہے چنانچہ صورت حال جاننے کے لیے رازداری سے پوچھا "کیا بات ہے" کہنے لگا "سوئی گیس کا بل جمع کرانا ہے!"

یہ واقفیت تلاش کرنے کا مرحلہ بجلی یا پانی کا کنکشن لینے، بجلی یا پانی کا بل جمع کرانے، اے جی آفس والوں سے اپنی حق حلال کی تنخواہ وصول کرنے، گھی کا ڈبہ اور سگریٹ کی ڈبیہ خریدنے حتیٰ کہ سر منڈانے اور اس کے بعد اولے کھانے تک کے دوران بار بار آتا ہے۔ چنانچہ ہم سب صبح اپنے گھروں سے نکلتے ہیں اور ایک دوسرے سے پوچھتے پھرتے ہیں "کوئی واقفیت ہے؟" اور سبھی ایک دوسرے کو "نہیں" میں جواب دیتے ہیں کیونکہ ہر ایک کو اپنی واقفیت سنبھال کر رکھنا پڑتی ہے تاکہ "مہینے کے آخر میں" اسے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا پڑے۔

ہمیں تو اس صورت حال سے کچھ خوف سا آنے لگا ہے۔ ہمیں خدشہ ہے کہ کل کلاں کوئی دوست ہمارے پاس آئے اور پوچھے "میاں صاحب ہیں کسی گورکن سے واقفیت ہے" ہم پوچھیں "وہ کس لیے؟" تو وہ جواب دے "مردہ دفن کرانا ہے۔"

ہمیں یقین ہے کہ اس صورت حال میں بھی لوگ "نہیں" میں جواب دیں گے کیونکہ اس صورت حال میں ہر ایک کو اپنا مردہ دفن کرانا ہوگا ہر ایک کو اپنی واقفیت سنبھال کر رکھنا ہوگی۔ ۱؎

۲۱ر ستمبر ۱۹۷۶ء

بکریوں کے درمیان ایک شام!

آج کے اخبار میں ایک تین سطری اعلان "اپنی بکری لے جائیں" شائع ہوا ہے جس میں اعلان کنندہ کی طرف سے کہا گیا ہے کہ: "گزشتہ شب مجھے ایک بکری ملی ہے جن صاحب کی ہو نشانی بتا کر لے جائیں۔ محمد سلیم ہرل مکان نمبر ۹ / ۱۱ (ہرل منزل) ملتان روڈ، نزد سوشل سیکورٹی لاہور۔" خدا کرے بکری والے کو اپنی بکری مل جائے کہ آج کل بکری کے بغیر زندگی بے کار ہے۔ کچھ بکریاں ہمارے پاس بھی ایک عرصے سے بطور امانت جمع ہیں اور دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ بھی ان کے مالکوں کو لوٹا دی جائیں۔ نشانیاں ہم بتا دیتے ہیں، اب یہ مالکوں کا کام ہے کہ وہ اولین فرصت میں اپنی بکریاں واپس لے جائیں کیونکہ یہ بکریاں دودھ نہیں دیتیں صرف مینگنیں دیتی ہیں۔

عالم دین بکری

یہ عالمِ دین بکری ہے، محکمہ اوقاف کی بکری ہے اس کی نشانی یہ ہے کہ وضع قطع کے علاوہ اس میں عالموں والی کوئی بات نہیں۔ یہ بکری جب سے ہمارے پاس ہے اس وقت سے برابر مطالبہ کر رہی ہے کہ جمعے کے روز اسے "اوور ٹائم" دیا جائے کیونکہ اس روز خطبے کا اضافی کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کا ایک مطالبہ یہ بھی ہے کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر نمازیوں کی کثیر تعداد کے پیشِ نظر اسے سال میں دو "بونس" دیئے جائیں۔ یہ اعلیٰ گریڈ گریجویٹی اور دیگر مراعات کا مطالبہ بھی کرتی ہے اس بکری کی زبان پر یہ مطالبہ بھی رہتا ہے کہ بیرونی ملکوں سے

آنے والے امرائے حکومت اور حکام کی مقامی ضیافتوں میں اسے بھی شرکت کی دعوت دی جائے یہ ریڈیو اور ٹیلیویژن کے پروگرام بھی مانگتی ہے بلکہ جب سے ہمارے پاس ہے کئی دفعہ کہہ چکی ہے کہ:

"مجھے ٹیلیویژن سٹیشن لے جاؤ"۔

اس بکری کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ ہر بات پر سر ہلاتی ہے ہر کاغذ پر دستخط کر دیتی ہے۔

شاعر بکری

یہ ادیب شاعر بکری ہے اس کی نشانی یہ ہے کہ ہر وقت اپنے خیالات میں مگن رہتی ہے۔ اپنے خیالات سے مراد یہ ہے کہ ہمہ وقت اپنے بارے میں سوچتی رہتی ہے یہ تحریر و تقریر کی سہولتیں نہیں مانگتی، صرف غیر ملکی دورے مانگتی ہے ثقافت کے نام پر نوکریاں مانگتی ہے ادبی حلقوں کے نام پر فنڈز مانگتی ہے، یہ بکری جب سے ہمارے پاس آئی ہے، مرکز اور صوبے کے بڑے بڑے لوگوں کے نام لے کر ہمیں مرعوب کرنے میں لگی رہتی ہے، اس کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ ہر وقت دھڑے قائم کرنے میں لگی رہتی ہے چنانچہ یہ بکری جب سے ہمارے پاس ہے ہم نے اسے کبھی لکھتے پڑھتے نہیں دیکھا۔ بس دھڑے بناتے ہی دیکھا ہے اس کی گفتگو بڑی الجھے دار ہے یہ بین الاقوامیت کی باتیں کرتی ہے کبھی ملکی موضوع پر گفتگو ہو تو اس میں حصہ نہیں لیتی کہتی ہے میں خود کو محدود یا مسدود نہیں کر سکتی، ایک روز ہمسائے کی شاعر بکری اس کے پاس چلی آئی دونوں گھنٹوں ایک دوسرے کو اپنا کلام سناتی رہیں اور ممیا ممیا کر داد دیتی رہیں بعد میں پیٹھ پھیرتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کے بارے میں کہا:

"یہ بوگس بکری ہے اسے چاہیئے کہ صرف گھاس ہی چرتی رہے، شاعری اس کے بس کی بات نہیں!"

صحافی بکری

یہ "قومیائی" گئی صحافی بکری ہے، یہ لوگوں کے بارے میں سب کچھ بتاتی ہے۔ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی ہم نے جب اسے بہت کریدا، تو اس نے چند ایک باتیں اپنے بارے

میں بتائیں۔ ہم نے پوچھا "تمہارا افسر کون ہے"؟ اس نے کہا "انفارمیشن افسر" باقی نشانیاں ہم نے یہ تلاش کی ہیں کہ یہ بہت سگھڑ ہے، بہت کم تنخواہ میں بہت اچھی زندگی بسر کرنا جانتی ہے یہ حکام کے سامنے ممیانے لگتی ہے اس کی چھوٹی سی دم ہے مگر ہر وقت اسے ہلاتی رہتی ہے ایک دفعہ ہم نے اس کی یہ دم پکڑ لی تو اس نے سر ہلانا شروع کر دیا۔

متفرق بکریاں

ان بکریوں کے علاوہ ہمارے پاس اور بھی بے شمار بکریاں ہیں۔ درج بالا بکریوں کی نشانیاں تو ہم نے بتا دی ہیں۔ باقی بکریوں کی نشانیاں ان کے مالکان بتا کر لے جائیں ہم صرف اتنا بتائے دیتے ہیں کہ عالمِ دین بکری، شاعر بکری، ادیب بکری، صحافی بکری کے علاوہ ہمارے پاس سیاستدان بکری، استاد بکری، مزدور بکری، کسان بکری، طالب علم بکری، وکیل بکری، غریب بکری بطور امانت موجود ہیں اور آپ جب چاہیں یہ بکریاں واپس لے جا سکتے ہیں۔

۱۵ اکتوبر ۷۶ء

اہلِ "قلم"

قلم لکھنے کے کام بھی آتا ہے، چنانچہ ہم نے کئی ایک لوگوں کو اس سے لکھتے ہوئے بھی دیکھا ہے تاہم بیشتر اہلِ قلم اس سے شلوار میں ناڑا ڈالتے ہیں ویسے یہ اہل قلم وہ ہیں جنہوں نے لمبی لمبی "قلمیں" رکھی ہوئی ہیں اور یوں "اہلِ قلم" کہلاتے ہیں۔ بہر حال قلم ایک مفید چیز ہے بشرطیکہ اس سے لکھنے کا کام نہ کیا جائے۔

۲۲۔ دسمبر ۱۹۷۶ء

عصمت چغتائی لاہور میں!

ہمارا تعلق اس نسل سے ہے جو عصمت چغتائی کی تحریریں پڑھ کر "بالغ" ہوئی ہے وہ ہماری پیدائش سے پہلے کی لکھ رہی ہیں اور انہوں نے اردو ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ ہم ان کے اس احسان سے سُر نہیں اٹھا سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان میں ان کی آمد کی خبر ادبی حلقوں میں ایک دھماکے کی طرح گونجی۔ عصمت چغتائی کے کراچی میں قیام کے دوران لاہور کے ادیب ان کے بارے میں شائع ہونے والی خبروں کی ٹوہ میں رہتے تھے اور انہیں اپنے اپنے نمبر کی عینک سے پڑھتے تھے۔ پھر ایک دن ٹی ہاؤس میں یہ خبر گرم ہوئی کہ وہ اپنی بھتیجی کے پاس لاہور پہنچ چکی ہیں اور پھر اس کے بعد سے اب تک تقریبات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ عصمت چغتائی کے اعزاز میں ایک تقریب ہمدرد فاؤنڈیشن والوں نے منعقد کی دوسری تقریب فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کی تھی اوڈینٹل کالج والوں نے انہیں الگ مدعو کیا تھا۔ ایڈیٹر نقوش جناب محمد طفیل نے پنجاب آرٹس کونسل میں ایک بارونق محفل جمائی اور ایک بالکل نجی محفل جمیلہ ہاشمی نے اپنے گھر میں منعقد کی جس میں لاہور کے سر کردہ ادیب شامل ہوئے ابھی مجلس نمود اردو کی تقریب باقی ہے۔ رائٹرز گلڈ کا جلسہ اور بہت سی "جُلسیاں" اس کے علاوہ ہیں!

جمیلہ ہاشمی کے ہاں ہم نے عصمت چغتائی کو زندگی میں پہلی بار دیکھا۔ سفید گھنگھریالے بال، سفید ساڑھی اور گہرا سانولا رنگ، عمر ۶۴ برس اور یہ وضاحت انہوں نے کر دی تھی کہ عورت

ہونے کے باوجود وہ اپنی عمر بالکل صحیح بتا رہی ہیں۔ یہاں گفتگو بھارت میں اردو کا مستقبل، کہانی اور علامتی کہانی، کہانی میں نئے اور پرانے ناموں سے ہوتی ہوئی پاکستان کے بارے میں بھارتی ادیبوں کے روّیے تک جا پہنچی۔ کشمیر کا ذکر بھی آیا۔ اس کے ساتھ نور جہاں کا تذکرہ چھڑا اور جب ذکر نور جہاں کا ہو رہا ہو تو نور جہاں کے ہم آواز "گلوکار" اور افسانہ نگار حضرت نوید انجم کا نام بھی ضرور آتا ہے۔ سو یہ نام یہاں بھی آیا، اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ پہلے دوسری باتیں سن لیں!

اردو کے بارے میں عصمت چغتائی نے بتایا کہ بھارت کی نئی نسل اردو رسم الخط سے بالکل بیگانہ ہے۔ بھارتی عوام کی ایک بڑی تعداد اردو بولتی ہے اور اردو سمجھتی ہے لیکن رسم الخط سے ناواقفیت کی بنا پر وہ اردو لکھ اور پڑھ نہیں سکتی۔ چنانچہ یہ نسل اپنے بزرگوں کے گراں قدر ادبی ورثہ سے یکسر بے خبر ہے حتیٰ کہ ان کی اپنی بیٹی اردو رسم الخط سے بیگانہ ہے۔ ایک روز عصمت نے جب اس سے کہا "بیٹی! کیا تم اپنی اماں کے تخلیقی کام سے تمام عمر ناواقف ہی رہو گی"؟ تو اس نے جواب دیا "میں اس کے بغیر بھی سروائیو" (SURVIVE) کر سکتی ہوں!" اس موقع پر جب ہم نے عصمت چغتائی سے پوچھا کہ کیا وہ اس صورت حال سے مطمئن ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ اس صورت حال سے کیسے مطمئن ہو سکتی ہیں؟ تاہم انہوں نے بتایا کہ بھارت میں بسنے والے اردو ادیب اس کے مداوا سے غافل نہیں ہیں چنانچہ ان کے مطالبہ پر ایک طرف تو اُردو رسم الخط کے فروغ کے لیے حکومت نے کمیٹیاں وغیرہ بنانا شروع کر دی ہیں اور دوسری طرف اردو کی کتابوں کو دیوناگری رسم الخط میں بھی ڈھالا جا رہا ہے۔ اس پر جناب اعجاز حسین بٹالوی نے پوچھا کہ دیوانِ غالبؔ کو دیوناگری میں کس طرح ڈھالا جائے گا؟ تو محترمہ عصمت چغتائی نے جواب دیا "دیوانِ غالبؔ دیوناگری میں ڈھالا جا چکا ہے اور اس کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہوئی ہیں۔ غالبؔ اور انکا کلام وہاں بہت مقبول ہے" اس پر اعجاز بٹالوی ہنسے اور کہنے لگے "ناگری رسم الخط میں تو وہ "غالب کی غزلیں" نہیں "گالب کی گجلیں" ہی پڑھتے ہوں گے"۔ اردو سے بات چلی تو اردو کہانیاں لکھنے والوں تک پہنچی۔ محترمہ عصمت چغتائی نے انور سجاد کے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ بھارت میں ان دنوں علامتی کہانیوں کا زور ہے اور اس موقع پر انہوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ یہ علامتی کہانیاں ان کی سمجھ میں نہیں آتیں ان کہانیوں پر دو تین اعتراضات انہوں نے

اور کئے اس پر انتظار حسین سے نہ رہا گیا اور انہوں نے کہا " علامتی کہانیوں پر آپ کے اعتراضات اسی نوعیت کے ہیں جس نوعیت کے اعتراضات کسی زمانے میں ایم اسلم نے آپ کی کہانیوں پر کئے تھے "!

گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا تو اعجاز حسین بٹالوی نے گفتگو کا رخ ایک ایسے موضوع کی طرف موڑ دیا جس پر گفتگو کی واقعی ضرورت تھی۔ انہوں نے عصمت چغتائی صاحبہ سے کہا " محترمہ ! میں ایک بات بڑے احترام سے کہنا چاہتا ہوں "! وہ متوجہ ہوئیں اور بولیں " کہو " اعجاز حسین بٹالوی نے کہا ہمیں بھارت میں بسنے والے اپنے ادیب بھائیوں سے گلہ ہے کہ وہ پاکستان کے بارے میں ابھی تک ۱۹۴۷ء کی رومانٹسزم کا شکار ہیں جب کہ ان کی یہ سوچ اس وقت بھی ریالیٹی نہیں تھی، عصمت چغتائی نے پوچھا " کیا مطلب "؟ اعجاز بٹالوی نے جواب دیا جب وہ قیام پاکستان کا ذکر کرتے ہیں تو بھارت اور پاکستان کے درمیان کھنچی " لکیر " کو بہت جذباتی رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ پیشتر ایک ادیبہ بھارت سے تشریف لائیں تو انہوں نے اس موضوع پر علی سردار جعفری کی ایک نظم پاکستانی دوستوں کو سنائی ان کا خیال تھا کہ یہ نظم سن کر یہاں رو رو کر لوگوں کی آنکھیں سوج جائیں گی مگر اس کا یہاں الٹا اثر ہوا۔ آپ براہِ کرم انہیں ہماری طرف سے یہ بتائیے کہ محبت اور اخوت کی باتیں اس وقت خیر سگالی کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔ جب دوسرے کا وجود دل سے تسلیم کر لیا جائے۔" اس پر عصمت چغتائی کے چہرے پر قدرے ردِ عمل ظاہر ہوا۔ اور پھر انہوں نے کہا۔ " ہم پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم کرتے ہیں ہمارا موٗقف تو صرف یہ ہے کہ اس لکیر کو خون کی لکیر کی بجائے صندل کی لکیر بنایا جائے " پیشتر اس کے کہ اعجاز بٹالوی اس کے جواب میں لب کھولتے عصمت چغتائی کی پاکستانی عزیزہ نے اس گفتگو پر ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ ایسی گفتگو نہ کیجیے جو ہمارے اور ان کے ملاپ میں کسی قسم کی رکاوٹ کا باعث بنے، وہ پہلے ہی تیئس سال بعد ان سے ملنے آئی ہیں۔ اس پر تمام ادیبوں نے انہیں سمجھایا کہ بی بی یہ سیاسی گفتگو نہیں ہے دونوں طرف بسنے والوں کا مفاد اس میں ہے کہ وہ سوجھ بوجھ سے کام لیں اور پاکستانی ادیب کی حیثیت سے یہ ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے اور اپنی قوم کے جذبات سے بھارت میں بسنے والے اپنے ادیب بھائیوں کو آگاہ کریں، مگر وہ بہت ڈری ہوئی لگتی

تھیں، سو انہوں نے یہ گفتگو آگے نہ بڑھنے دی۔ اس پر محفل میں کچھ بدمزگی سی پیدا ہو گئی جسے عصمت چغتائی تاڑ گئیں۔ چنانچہ انہوں نے محفل کی شگفتگی کو برقرار رکھنے کے لیے کہا "آپ تو ہم سے یونہی جھگڑتے ہیں! ہم نے تو کہہ دیا تھا کہ ہمیں نور جہاں دے دیں، اس کے بدلے کشمیر ہم سے لے لیں۔" اس پر امجد اسلام امجد کی رگ ظرافت بھی پھڑکی اور انہوں نے کہا "کسی ادلے بدلے کی ضرورت نہیں، آپ نور جہاں ہم سے ویسے ہی لے لیں" انتظار حسین نے ٹکڑا لگایا۔ اور اس کے ساتھ نوید انجم بھی!

۱۹ر اکتوبر ۷۶ء

شناخت پریڈ

زاہد ڈار ان دنوں ٹی ہاؤس میں نظر آتے ہیں تو سکندر کی طرح خالی ہاتھ ہوتے ہیں لوگوں کا کہنا ہے کہ ہنگاموں نے ان کے ہاتھ سے کتاب چھین لی ہے۔ شاعری کے "بحر الہند" فیض احمد فیض" غالباً ان دنوں پھر وہاں ہیں، جہاں سے اپنی خبر بھی نہیں آتی۔ "بحرِ ظلمات" حفیظ جالندھری بھی ان دنوں بھارت میں ہیں۔ اس مہینے شاعری کے "بحیرۂ عرب" عبدالعزیز خالد کا کوئی شعری مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا۔ تنقید کے "بحرِ منجمد" ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بارے میں بھی راوی چین ہی لکھتا ہے۔ اِدھر شاعری کی "نہر سویز" کشور ناہید واپس لاہور پہنچ چکی ہیں۔ سلام آباد کے "پیروں فقیروں" نے انہیں غالباً خاصا مایوس کیا ہے۔!

۶ر مئی ۷۷ء

رب کا شکر ادا کر بھائی!

ہم سب کو رب کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیئے کیونکہ اس نے ہم سب کو گائے بنایا ہے یہ فقرا کچھ غلط ہو گیا ہے، نصابی کتابوں میں ہم نے اس طرح نہیں پڑھا تھا۔ نصابی کتابوں میں تھا کہ ہم سب کو رب کا شکر ادا کرنا چاہیے کیونکہ اس نے ہمارے لیے گائے بنائی۔ گائے بہت مفید جانور ہے۔ یہ دودھ دیتی ہے اس کے علاوہ یہ بہت بھلی مانس بھی ہے کیونکہ جو آتا ہے اسے چوکر چلا جاتا ہے۔ ہم بھی بہت بھلے مانس ہیں گائے بھی بہت بھلی مانس ہے گائے بھی مفید جانور ہے ہم بھی بہت مفید ہیں

ہم سب کو رب کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے کیونکہ اس نے ہماری بکری بھی بنائی ہے بکری دودھ دیتی ہے۔ مینگنیں بھی دیتی ہے۔ بکری دودھ میں مینگنیں ملا کر بھی دیتی ہے ہم بھی دودھ میں مینگنیں ملا کر دیتے ہیں۔ بکری درختوں کے پتے کھا کر خدا کا شکر ادا کرتی ہے ہمیں بھی درختوں کے پتے کھا کر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ بکری مکان بنا کر نہیں رہتی کیونکہ بکری ہوتے ہوئے بھی اس میں بعض صفات شاہین کی پائی جاتی ہیں

کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

ہمیں بھی مکان کی فکر نہیں ہونی چاہیئے۔ بکری خدا کی بخشی ہوئی پوشاک پر گزارہ کرتی ہے۔ ہمیں بھی تن ڈھانپنے کی فکر نہیں ہونی چاہیئے۔ ہمیں بکریوں کی طرح زندگی بسر کرنا چاہیئے! بکریاں بہت شریف ہوتی ہیں، بہت صابر ہوتی ہیں۔

ہم سب کو رب کا شکر ادا کرنا چاہیئے، جس نے بلی بنائی۔ بلی بہت خوبصورت جانور ہے۔ اسے ہم گود میں لے کر پیار کرتے ہیں، پیار کے رستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم بلی کو پیار نہ کرتے کیونکہ بلی چوہے کھاتی ہے۔ لیکن بلی کی اسی ادا سے تو ہمیں پیار ہے اور ہم اسے گھروں میں چوہے کھانے کے لیے ہی رکھتے ہیں۔ ہم بھی بلیاں ہیں اور چوہے کھانے پر مامور ہیں۔ بلی کی مونچھیں بہت لمبی لمبی ہوتی ہیں مگر یہ وہ مونچھیں نہیں ہیں جنہیں وہ تاؤ دے سکے۔ بلی کو یہ فکر بھی نہیں ہوتی کہ مونچھ کہیں نیچی نہ ہو جائے اسی لیے ہم اسے پیار کرتے ہیں۔ بلی کی اگر مونچھیں لمبی ہیں تو اس کی دم بھی بہت لمبی ہے جو وہ بوقتِ ضرورت ہلانے لگتی ہے مونچھ دکھانے کے لیے اور دم ہلانے کے لیے ہوتی چاہیئے کہ یہ کامیاب زندگی کی علامت ہے بلی ایک کامیاب جانور ہے ہمیں بھی کامیاب ہونا چاہیئے۔ اگر ہماری صرف مونچھ ہے تو ہمیں فوراً دم اُگانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ہم سب کو رب کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے جس نے ہمارے لیے اونٹ بنایا، اونٹ کی بہت قدر وقیمت ہے اور اسے بہت عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ آج کل جس کی کوئی کل سیدھی نہ ہو وہ ترقی کی منازل بہت تیزی سے طے کرتا ہے اونٹ کو صحرائی جہاز بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ کئی کئی دن تک بغیر کھائے پیئے سفر کر سکتا ہے یہ بغیر کھائے پیئے والی بات ایک مغالطہ ہے کیونکہ اونٹ نے اپنی کوہان میں اناج ذخیرہ کیا ہوتا ہے اور سفر کے دوران وہ یہ ذخیرہ استعمال میں لاتا ہے اس کی قدر وقیمت کی ایک وجہ یہ ذخیرہ اندوزی بھی ہے ذخیرہ اندوزوں کو ہمارے ہاں بہت عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اونٹ کی سواری بہت "لذیذ" ہوتی ہے اور اونٹ کی قدر وقیمت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر کوئی اس پر سواری کر سکتا ہے۔ بعض بونے جب اونٹ پر سوار ہوتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو بلند قامت سمجھنے لگتے ہیں چنانچہ ان دنوں بہت سے بونے اونٹوں پر سوار ہیں اور ہم انہیں بلند قامت سمجھتے ہیں اونٹ کی سماجی خدمات بہت زیادہ ہیں اور ہم اس کے احسانات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

ہم سب کو رب کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیئے جس نے ہمارے لیے گھوڑا بنایا۔ گھوڑا بہت طاقتور جانور ہے یہ میلوں دوڑتا ہے اور اس کا سانس نہیں پھولتا۔ کیونکہ یہ سگریٹ نہیں پیتا۔ اسکی

طاقت کا اصل راز یہ ہے کہ یہ سوچنے سمجھنے کی لعنت سے پاک ہوتا ہے چنانچہ گردوپیش کے حالات اسے پریشان نہیں کرتے ہمیں بھی گھوڑے کی طرح طاقت ور ہونا چاہیے اور کسی تانگے کے آگے جت جانا چاہیئے۔

۱۶ نومبر ۷۶ء

انتخابی منشور

ہم نے عاشق کی گفتگو سنی تو حیران ہوئے اور پوچھا کہ :۔ "کامیابی کی صورت میں اس "انتخابی منشور" کا کیا بنے گا۔؟" اس پر وہ ہنسا اور کہنے لگا کہ کچھ بھی نہیں بس اس منشور کی پہلی شق پوری کرنے کے مطالبے پر محبوب کو سمجھانا ہے کہ آسمان سے تارے توڑ کر لانا کسی بندہ بشر کے بس کا روگ نہیں یہ وعدہ تو محض جذبات میں آکر کیا گیا تھا اور اس میں "تارے" کو "استعارے" کے طور پر استعمال کیا گیا تھا دوسرے مطالبے کے بارے میں اسے بتانا ہے کہ گو زمین پر کہکشاں بچھانے کا کام خاصا مشکل ہے لیکن انشاءاللہ یہ وعدہ پورا کر دیا جائیگا۔ یہ کہنا اسلیئے ضروری ہے کہ محبوب کے ساتھ "رابطہ" قائم رہے اور وہ عاشق کے پیچھے پیچھے چلتا رہے۔ تیسرا وعدہ یعنی میں تمہارے لئے جان قربان کردوں گا۔ یاد دلائے جانے پر محبوب کی گردن میں باہیں ڈال دی جائیں اور کہا جائے:

"جانِ من! اگر میں ہی نہ رہا تو یہ وعدے کون پورے کریگا؟"

۱۳۔ نومبر ۱۹۷۵ء

براہِ کرم ایک نظرِ کرم!

گذشتہ روز ہم نے ٹیلی ویژن پر ایک فلم دیکھی، جس میں ہیرو ایک محفل میں قوالی کر رہا ہے واضح رہے ہیرو پیشے کے لحاظ سے بھی قوال نہیں ہے، لیکن ہر فن مولا ہونے کے ناطے سے چونکہ اسے قوال بھی ہونا چاہیئے، لہٰذا اسے قوالی کرتے دکھایا گیا تھا، سامنے مرد بیٹھے تھے اور ہیرو کی پشت کی طرف باریک پردے کے پیچھے خواتین کو بیٹھے دکھایا گیا تھا، ان میں سے ہیرو صاحب کی ہیروئن بھی تھی۔ ہیرو نے پہلے دو بول حاضرین کی طرف منہ کر کے گائے پھر اس کے بعد انہوں نے حاضرین کی طرف باقاعدہ پُشت کر لی اور زنان خانے کی طرف منہ کر کے قوالی فرمانے لگے۔ نہ صرف یہ کہ آپ نے پوری قوالی حاضرین کی طرف پشت کر کے کی بلکہ اس دوران زنان خانے میں بیٹھی ہیروئن کے ساتھ باقاعدہ اشارہ بازی بھی کرتے رہے۔ فلم میں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوالی ختم ہونے سے پہلے ہی گوہرِ مقصود ان کے ہاتھ آگیا، فلم سے باہر اسکا جو نتیجہ نکل سکتا ہے، اس سے ہم سب واقف ہیں۔ یا قریباً ہر فلم میں ایک تکنیک یہ دکھائی جاتی ہے کہ ہیروئن بھری سڑک پر سے گذر رہی ہے اور ہیرو اس کے پیچھے پیچھے کوئی شوخ سا گانا گاتا چلا جا رہا ہے، گانے کے تین چوتھائی حصے تک وہ مُڑ مُڑ کر ہیرو کو غصے سے دیکھتی ہے، بِپھرتی ہے مگر ہیرو اس کیفیت سے بے نیاز اپنے کام میں مگن رہتا، بلکہ اس دوران وہ چھوٹی موٹی دست درازی کا مظاہرہ بھی کرتا ہے، گانا ختم ہونے پر ہیروئن سپر ڈال دیتی ہے فلم سے باہر جب کوئی نوجوان یہ پرچہ ترکیب استعمال سامنے رکھ کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کوئی اس کے پسینے کے ساتھ نہیں لگتا، اگر کچھ لگتا ہے تو دفعہ ۱۰۹ لگتی ہے۔

اور یہ ٹی وی کمرشلز والے بھی غلط لوگ ہیں، ان کے کہے پر کوئی عمل تو نہیں کرتا لیکن اگر کرنے بیٹھ جاتے تو پھر دنیا میں کوئی اور کام نہ کرے، صرف ایک سگریٹ پینے کے لئے اس کی ساری عمر بیت جائے، سگریٹ کی کمرشل میں یہی تو دکھایا جاتا ہے کہ ایک نوجوان کسی دوشیزہ کے ساتھ لندن پیرس، میونخ، ایمسٹرڈیم اور نیویارک وغیرہ کے قابلِ دید مقامات کی خاک چھانتا نظر آتا ہے اور ہر جگہ اشتہاری کمپنی کے مطلوبہ سگریٹ کا ایک کش لے کر آگے کو کوچ کر جاتا ہے اسی طرح اگر نہانے کیلئے صابن کی ایک کمپنی کے مشورے پر عمل کیا جائے تو الفلاح بلڈنگ کی چھت کی منڈیر پر غسل کرنا ہوگا اور اس صورت میں یہ غسل آخری "غسل" بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک آر سی کولا پینے کے لئے دس پندرہ لڑکے لڑکیوں کو اکٹھا کرنا ہوگا اور خاصی دھما چوکڑی کے بعد یہ مشروب نوش جاں کرنے کی نوبت آسکے گی اور مسلم کمرشل والوں کی کمرشل دیکھ کر تو لگتا ہے کہ وہ تیس پرسینٹ منافع صرف خواتین کو دیتے ہیں، اور وہ بھی اس صورت میں اگر وہ مخصوص چال چلتے ہوئے مینجر کے پاس جائیں اور گردن کو ذرا سا خم دیکھ کر پوچھیں "تھرٹی پرسینٹ" سو یار لوگ یہ جھنجھٹ نہیں پالتے، آرام سے بازار جاتے ہیں، ٹیلی ویژن پر دیکھے ہوئے اشتہار کے مطابق خریداری کرتے ہیں، اور پھر ان اشیاء کو سیدھے سادے انداز میں استعمال کر ڈالتے ہیں اگر استعمال کے دوران ان چیزوں میں وہ تاثیر نظر نہیں آتی جس کا دعوےٰ اشتہار میں کیا گیا تھا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ "پرچہ ترکیب استعمال" پر پوری طرح عمل نہیں کرتے۔

سو ہماری مختصر گذارش فلم والوں اور ٹی وی کمرشل والوں سے یہ ہے کہ للّٰہ لوگوں کو امتحان میں نہ ڈالو، خود جیو دوسروں کو جینے دو، لیکن اگر یہ ان کی کاروباری مجبوری ہے تو پھر جہاں وہ "کرم" کرم کرتے ہیں، وہاں تھوڑی سی نظرِ کرم بھی کریں، لوگ اناڑی ہیں، ان کے لیے یہ تمام لوازمات پورے کرنا ممکن نہیں جو فلم اور اشتہارات میں دکھائے جاتے ہیں، نیز اس کا ایک سبب کم فرصتی اور کم ہمتی بھی ہے، سو وہ چار پیسے زیادہ لے لیا کریں اور اپنی نگرانی میں مطلوبہ ماحول بھی پیدا کر دیا کریں۔ ان کے اس اقدام سے آجر اور تاجر کے درمیان "خیر سگالی" کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں!

۲۰ دسمبر ۱۹۷۶ء

بابا جی کے ملفوظات!

ان دنوں ہم نے ایک بابا جی کے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور دن کا بیشتر حصہ ان کی صحبت میں گزار رہے ہیں وہ جب گفتگو کرتے ہیں تو ان کے مُنہ سے حکمت و دانائی کے پھول جھڑتے ہیں اور معرفت کی گھتیاں سلجھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ گزشتہ روز ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ہمیں دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ہم اُن کی اس بے رُخی سے پریشان ہوئے تو انہوں نے رُخِ انور ہماری طرف کیا اور فرمایا: "مورکھ ہم تم سے ناراض نہیں ہیں"۔ اس پر ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کی "اگر ایسا ہے تو حضور نے اس خاکسار کو دیکھ کر منہ دوسری طرف کیوں پھیر لیا تھا؟ فرمایا اے مٹی کے مادھو! ہم نے ایسا صرف تمہیں دیکھ کر ہی نہیں کیا تھا بلکہ جسے بھی اسمبلی کا ٹکٹ ملا ہے۔ ہم نے آج اسے دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیا ہے۔" عرض کیا۔ وہ کیوں؟ فرمایا! "میرے مرشد کا ارشاد ہے کہ اگر کوئی دنیا کا بندہ تمہارے سامنے آئے تو منہ پھیر لو میں نے اپنے مرشد کی روح کی تسکین کے لیے ایک بار مُنہ پھیر لیا تھا۔ اب سناؤ تمہاری انتخابی مہم کا کیا حال ہے؟" عرض کیا۔ "وہ تو ٹھیک جا رہی ہے مگر حضور میرے کچھ ساتھی بلا مقابلہ منتخب ہو گئے ہیں، مجھ گنہگار کو الیکشن لڑنا پڑ رہا ہے" اس پر بابا جی نے سر جھکایا اور مراقبے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا اور فرمایا:۔

"تم بھی بلا مقابلہ منتخب ہو جاؤ گے۔"

عرض کی۔ "میرے مخالف امیدواروں کے کاغذات درست پائے گئے ہیں، ان کی صحتیں بھی بہت اچھی ہیں اور مستقبل قریب میں ان کی وفات کا بھی کوئی امکان نہیں۔"

اس پر باباجی نے سُرخ سُرخ آنکھوں سے ہمیں گھُورا اور عالم غضب میں فرمایا:۔

" اس کے باوجود تم بلامقابلہ منتخب ہو جاؤ گے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اپنی طرف سے نہیں کہتے۔ "

ایک اور ٹکٹ یافتہ عقیدت مند نے عرض کی:۔

"حضور! میرے مستقبل کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟"

" فرمایا مخدوش ہے۔ کچھ کو اس لئے ٹکٹ ملے ہیں کہ انہیں جیتنا ہے اور کچھ کو اس لئے کہ انہیں ہارنا ہے۔ جب عوام تمہیں ناکام بنادیں گے تو پارٹی لیڈرشپ کو تم آنکھیں دکھانے کے قابل نہیں رہو گے"

" اس صورت میں کیا کرنا چاہیئے۔!"

فرمایا: اپنے لچھن درست کرنے چاہئیں"۔ خدا کے حضور اپنے گناہوں کی گڑگڑا کر معافی مانگنا چاہیئے!"

ایک عقیدت مند نے اپنی انتخابی مہم کے سلسلہ میں مشورہ کیا۔ باباجی نے فرمایا:۔

"تم نے عوام کی بہت خدمات انجام دی ہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے گزشتہ گرمیوں میں تم نے شاہراہ قائدِ اعظم پر پانی کے چار مٹکے رکھوائے تھے۔ عوام کو اپنی یہ خدمات یاد دلاؤ، مولا کرم کرے گا!"

ایک متوقع رکنِ اسمبلی نے عرض کی " حضور! میرے علاقے کے عوام میرے بہت خلاف ہیں، میری پارٹی کے لوگ بھی مجھے پسند نہیں کرتے، مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

فرمایا: ان کے پاس جانا چاہیئے۔ عرض کی "گزشتہ کئی دنوں سے جا رہا ہوں مگر وہ منہ نہیں لگاتے"۔

" فرمایا یہ چار دن عوام کے نخرے اٹھانے کے ہوتے ہیں۔ اگر وہ جوتے بھی ماریں تو کھا لینے چاہئیں، اس کے بعد دیکھی جائے گی!"

ایک اور عقیدت مند نے بیلٹ بکس باباجی کی خدمت میں پیش کیا اور گزارش کی "میں آج ہی بڑھئی سے بنوا کر لایا ہوں، اس پر میں نے اپنا انتخابی نشان بھی چسپاں کیا ہے میں شگون کے طور پر اسے اپنے پاس رکھوں گا۔ آپ پڑھ کر دم کر دیں" باباجی نے بیلٹ بکس پر دستِ شفقت پھیرا کچھ پڑھ کر دم کیا اور فرمایا:

" اللہ برکت دے گا!"

ایک سُرپھرے نے عرض کی۔ "مجھے قومی اتحاد والوں نے پھر ٹکٹ دے دیا ہے۔ مگر اپوزیشن مجھے

واس نہیں آتی۔ گزشتہ برس پریشانی کی وجہ سے مجھے زکام ہوگیا تھا اور مجھے واپس پارٹی میں آنا پڑا تھا!"
باباجی نے فرمایا:۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں، جب تم کامیاب ہو جاؤ اور محسوس کرو کہ تمہیں پھر سے زکام ہونے لگا ہے تو دوبارہ پارٹی میں آجانا۔ شریعت کی رو سے اپنی جان کی حفاظت فرض اولیں ہے اور اس کے لیے مباح چیزیں بھی حلال ہو جایا کرتی ہیں۔" عرض کی، "مگر میں اپنے ووٹروں کو کیا جواب دوں گا۔؟" فرمایا انہیں کہنا مجھے قومی اتحاد نے ٹکٹ دیا تھا اور اب میں "قومی اتحاد" ہی کی خاطر پیپلز پارٹی میں شمولیت کر رہا ہوں۔!"

۲۵ /جنوری ۱۹۷۷ء

ـــــــــــ فورگیٹ می ناٹ

کارڈوں کی ایک قسم خالص کمرشل نوعیت کی بھی ہے اور یہ کارڈ بھیجنے والے بڑی عید کو اپنے "کرم فرماؤں" کے لیے بکرے کی ران اور چھوٹی عید کو "پاؤ بھر" عید کارڈ بھیج کر اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں۔ اس قسم کے عید کارڈوں پر جگہ جگہ (بزبان حال) فورگیٹ می ناٹ (FORGET ME NOT) لکھا ہوتا ہے اور ہم جب کبھی یہ کاروباری عید کارڈ موصول کرتے ہیں ہمیں یوں لگتا ہے جیسے ٹکے یا بجلی کا بل وصول کر رہے ہوں۔

۱۴/ ستمبر ۱۹۷۷ء

جادوگر!

ہم نے انتخابی نتائج کے لیے تمام رات قیامت کا انتظار کیا ہے ٹیلیویژن سامنے تھا، ٹرانسسٹر ہاتھوں میں تھا۔ چہروں سے اکتاتے تھے۔ تو ریڈیو آن کر کے صرف آوازیں سنتے تھے اور آوازوں سے بور ہونے لگتے تھے تو چہرے دیکھنے کے لیے ٹی وی آن کر لیتے تھے ریڈیو اور ٹیلیویژن دونوں سے انتخابی نتائج نشر ہو رہے تھے۔ ہمیں نتائج کا زیادہ شدت سے اس لیے بھی انتظار تھا کہ دیکھیں ہمارے ووٹ کے بغیر کون مائی کا لال کامیاب ہوتا ہے یہ بات ہم یوں کہہ رہے ہیں کہ ہزار منت سماجت کے باوجود الیکشن کمیشن والوں نے ہمارا ووٹ نہیں بنایا تھا۔ سو ہم ووٹ تو نہیں ڈال سکے۔ مگر اس سے کم از کم یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ہماری عمر تاحال اکیس سے کم ہے ہم "مناسب" مواقع پر اپنی عمر بیس اکیس ہی بتاتے تھے تو کوئی مانتا نہیں تھا۔ اب جس کسی کو ہماری تبلائی ہوئی عمر کے بارے میں کوئی شک ہو۔ وہ الیکشن کمیشن سے رجوع کرے خیر ہم بتا یہ رہے تھے کہ ہمارے ووٹ کے بغیر بہت سے مائی کے لال کامیاب ہو گئے اور اس کا علم ہمیں ریڈیو ٹی وی سے نشر ہونے والے انتخابی نتائج سے ہوا۔ ٹیلی ویژن سامنے اور ٹرانسسٹر ہاتھوں میں تھا۔ کبھی چہرے اچھے لگنے لگتے تھے اور کبھی آوازیں دلربا معلوم ہوتی تھیں اور کبھی ان دونوں سے جی اکتا جاتا تھا اور ہم ریڈیو ٹی وی آف کر کے کافی کے گھونٹ پینے لگتے تھے

ٹیلی ویژن سے ایک اناؤنسر بتا رہے تھے کہ حنیف رامے جزوی طور پر انتخاب ہار رہے ہیں رفیق احمد باجوہ کے ووٹ ان کے مخالف امیدوار سے کم ہیں مولانا عبیداللہ انور کی پوزیشن کمزور ہے چودھری ظہور الٰہی ہار رہے ہیں چودھری رحمت الٰہی ہار رہے ہیں ملک قاسم کی بھی یہی پوزیشن ہے کچھ یہی صورت حال پنجاب کے دوسرے شہروں کی بھی تھی پیپلز پارٹی کے امیدوار بھاری اکثریت سے کامیاب ہو رہے تھے اور قومی اتحاد والے ہر جگہ ہار رہے تھے۔ ان انتخابی نتائج کے درمیان میں تفریحی پروگراموں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ پیپلز پارٹی کی بھاری کامیابی کے اعلانات کے دوران دکھائے جانے والے ان پروگراموں میں سے ہمیں "جادوگر" پروگرام سب سے اچھا لگا۔ ٹیلیویژن والوں نے اس پروگرام میں ایک جادوگر کو بلایا تھا جس نے جادو کے ذریعے یا ہاتھ کی صفائی سے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر دکھایا۔ اس نے ایک خالی ڈبہ ناظرین کو دکھایا اور پھر چھومنتر پڑھ کر ڈبہ کھولا تو اس میں سے پھول برآمد ہوئے، پھول جو ہار بنانے کے کام آتے ہیں یعنی جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔

الیکشن کمیشن والوں نے چونکہ ہمیں نابالغوں میں شمار کیا تھا اور یوں ہم نہ صرف ووٹ ڈالنے بلکہ "صرف بالغوں کے لیے" مارکہ فلمیں دیکھنے کے حق سے بھی محروم ہو گئے جو الیکشن کے دوران پورے ملک میں کھلے بندوں دکھائی گئیں۔ لہذا ہماری بلا کو کون جیتا کون ہارا؟ البتہ ایک دوست جو پیپلز پارٹی کو ووٹ ڈال کر آیا تھا۔ صبح ملا تو انتخابی نتائج سے بہت افسردہ تھا۔ ہم اس کی اس افسردگی پر حیران ہوئے اور پوچھا "عزیزم خیریت تو ہے؟" بولا "خیریت ہے مگر قومی اتحاد کے اس طرح "ووداش" ہو جانے پر سخت افسوس ہوا ہے"۔ ہم اس پر مزید حیران ہوئے اور کہا "مگر تم نے تو ووٹ پیپلز پارٹی کو ڈالا ہے؟" بولا "میں چاہتا تھا کہ حکومت بھٹو کی بنے مگر اپوزیشن مضبوط آئے۔"

تو پھر تمہیں ووٹ قومی اتحاد کو ڈالنا چاہیئے تھا! ہم نے کہا

"ارادہ تو یہی تھا" اس نے جواب دیا، "مگر لوگ ہل کی حمایت اس جوش و خروش کے ساتھ کر رہے تھے کہ مجھے یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں بھٹو ہار نہ جائے چنانچہ میں نے آخری لمحے اپنا فیصلہ بدل دیا اور ووٹ تلوار کو ڈال آیا!"

۱۰ / مارچ ۷۷ء

زید نے بکر سے پوچھا "فرض کرو۔ چڑیا گھر سے ایک شیر رہا ہو کر تم پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں تم کیا کرو گے؟" بکر نے جواب دیا "چڑیا گھر میں حفاظتی اقدامات خاصے مضبوط ہوتے ہیں۔ شیر رہا نہیں ہو سکتا"! زید نے کہا "فرض کرو ایسا ہو جاتا ہے"؟ بکر بولا "چلو فرض کیا ایسا ہو جاتا ہے مگر یہ کیا ضروری ہے کہ شیر سارا شہر چھوڑ کر مجھی پر حملہ آور ہو؟ زید نے کہا "تم فرض کر لو" بکر نے فرض کر لیا اور کہا "اس صورت میں میں بھاگ کر درخت پر چڑھ جاؤں گا!" زید بولا، شیر درخت پر چڑھ کر تمہیں ہڑپ کر جائیگا" بکر نے جواب دیا "ایسا نہیں ہو سکتا، کیونکہ شیر درخت پر چڑھنا نہیں جانتا" زید نے کہا کہ فرض کرو ایسا ہو جائے تو تم کیا کرو گے؟ بکر بولا "میں درخت پر سے چھلانگ لگا دوں گا"

"شیر بھی درخت سے چھلانگ لگا دے گا" زید نے کہا

"میں بھاگنا شروع کر دوں گا"

"شیر بھی تمہارے پیچھے بھاگے گا"

"میں دریا میں چھلانگ لگا دوں گا"

"شیر بھی دریا میں چھلانگ لگا دے گا"

"میں تیر کر دوسرے کنارے پہنچ جاؤں گا"

"شیر بھی تیر کر دوسرے کنارے پر پہنچ جائے گا اور تمہیں کھا لے گا"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شیر تیرنا نہیں جانتا"

"تم فرض کرو کہ اگر ایسا ہو جائے؟" زید نے کہا

"میں فرض کر لیتا ہوں" بکر نے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا "مگر تم یہ بتاؤ تم میرے ساتھ ہو کہ شیر کے ساتھ ہو؟"

یہ لطیفہ ہمیں بلاوجہ یاد نہیں آیا بلکہ آج کل دورانِ گفتگو دن میں تین چار مواقع ضرور ایسے آتے ہیں۔ جب مخاطب سے پوچھنا پڑتا ہے کہ "تم میرے ساتھ ہو یا شیر کے ساتھ ہو؟" اور ایسی گفتگو کرنے والے یا تو قومی اتحاد کے کارکن ہوتے ہیں یا ان کی ہمدردیاں پیپلز پارٹی کے ساتھ ہوتی ہیں چنانچہ وہ ایک دوسرے سے مفروضے قائم کراتے چلے جاتے ہیں حتےٰ کہ وہ مقام آجاتا ہے جب ان میں سے کسی ایک کو شیر کا نوالہ بننا ہوتا ہے ایسے مواقع پر وہ مزید مفروضے قائم کرنے سے انکار

کر دیتے ہیں اور یہ پوچھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "تم شیر کے ساتھ ہو یا میرے ساتھ ہو؟"

اس شیر کے حوالے سے عوام کو اور بہت سے شیر یاد آرہے ہیں مثلاً دورانِ گفتگو شیرِ پنجاب غلام مصطفےٰ کھر کا حوالہ درمیان میں آجاتا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں "شیرِ پنجاب کو کیا ہوا؟" جواب ملتا ہے "یہ ترکیب ہی غلط ہے شیر باہر کا جانور ہے۔ پنجاب میں شیر نہیں پائے جاتے!"

لوگ شیرِ سرحد خان عبدالقیوم خان کو بھی یاد کر رہے ہیں ایک دوست نے دوسرے سے پوچھا "اگر شیر "رہا" ہو کر قومی اتحاد کے ساتھ مل جائے تو کیا ہوگا؟"

"حفاظتی اقدامات خاصے پیچیدہ ہیں یہ رہا ہو کر بھی رہا نہیں ہوگا" دوست نے جواب دیا

"تم فرض کرو اگر ایسا ہو جاتا ہے!"

"تو قومی اتحاد والے دوڑ لگا دیں گے"

"شیرِ سرحد بھی ان کے پیچھے بھاگے گا!"

"وہ درخت پر چڑھ جائیں گے"

"شیر بھی درخت پر چڑھ جائے گا۔"

"شیر درخت پر نہیں چڑھ سکتا اور بوڑھا شیر تو بالکل نہیں چڑھ سکتا!"

"فرض کرو اگر ایسا ہو جائے تو اتحاد والے کیا کریں گے؟"

"اتحاد والوں کو اصولاً "دریا میں چھلانگ لگا دینا چاہیئے اور تیر کر کنارے پر پہنچ جانا چاہیئے"

"شیر بھی تیر کر کنارے پر پہنچ جائے گا!"

"شیر تیر نہیں سکتا"

"تم فرض کرو کہ اگر ایسا ہو جائے"

"میں فرض کر لیتا ہوں" دوست نے جواب دیا "مگر تم یہ بتاؤ تم اتحاد والوں کے ساتھ ہو یا ان شیر صاحب کے ساتھ ہو؟"

۱۶ر مارچ ۱۹۷۷ء

سکرین بیوٹی !

ہمارے قارئین کو ہماری تصویر پر بہت اعتراض ہے بلکہ اعتراضات ہیں. پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ اس میں "عطاُ الحقیت" نظر نہیں آتی بلکہ ایک غیر ثقہ قسم کے شخص کا ہیولا ذہن میں گھومتا ہے دوسرا اعتراض ان لوگوں کی طرف سے ہے جنہیں ہم سے "شرفِ ملاقات" حاصل ہو چکا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ایک "بزرگ" قسم کے شخص کو اپنی نوجوانی بلکہ کم سنی کے دَور کی تصویر شائع نہیں کروانی چاہیئے اور تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اصل اور نقل میں زمین آسمان کا فرق ہے "سکرین بیوٹی" کا مطلب سکرین بیوٹی ہی ہوتا ہے چنانچہ ملاقات پر یہ بھرم کھل جاتا ہے، لہذا ایک اعتراض انہیں اس سکرین بیوٹی پر بھی ہے !

اس سلسلے میں جہاں تک ہمارے نقطۂ نظر کا تعلق ہے ہم ان میں سے کوئی ایک الزام بھی ماننے کو تیار نہیں ہیں جہاں تک نام کے ثقہ ہونے اور تصویر میں غیر ثقہ نظر آنے کا سوال ہے ہم اسے کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں سمجھتے بلکہ فی زمانہ یہ ایک کوالیفکیشن ہے کہ انسان کے "قول و فعل" میں تضاد ہو یہ ایک لیڈرانہ خصوصیت ہے اور ہم اسے "اون" کرتے ہیں دوسرا اعتراض ملاقاتیوں کا ہے کہ تصویر میں ہم "چھوکرے" سے نظر آتے ہیں جبکہ درحقیقت ہم میں بزرگی کے آثار پائے جاتے ہیں ہم اس اعتراض کو بھی رد کرتے ہیں اور یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ فی زمانہ "چھوکراپن" بھی ایک لیڈرانہ کوالیفکیشن ہے اور یوں ہم اس خصوصیت کو بھی "اون" کرتے ہیں تیسرا اعتراض سکرین بیوٹی پر ہے اس سلسلے میں بھی

ہمارا نقطۂ نظر یہی ہے کہ اصل چیز "سکرین بیوٹی" ہی ہوتی ہے دنیا کے تمام سیاست دان اسی کے ذریعے کاروبار مملکت چلاتے ہیں چنانچہ ذرائع ابلاغ اصل شکلوں کی بجائے ان کی یہ "سکرین بیوٹی" ہی عوام کو دکھاتے ہیں اور ان کا دل لبھاتے ہیں

سکرین بیوٹی ہی کے سلسلے میں ہٹلر کے متعلق "شنید" ہے کہ وہ آنجہانی ہونے کے بعد جنت میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ دروازے پر متعین فرشتے نے اسے روک لیا اور جنتیوں کی فہرست میں اس کا نام تلاش کرنے لگا۔ جب اس فہرست میں ہٹلر کا نام کہیں نظر نہ آیا تو اس نے معذرت کی اور کہا "آپ جنت میں داخل نہیں ہو سکتے آپ کا نام اس فہرست میں نہیں ہے"۔ ہٹلر نے یہ سنا تو آگ بگولا ہو گیا اور بولا "یہ کیسے ممکن ہے کہ جنت کے دروازے مجھ پر بند ہوں، میں نے اپنی قوم کی زبردست خدمت کی ہے اور اسے پستیوں سے نکال کر بلندیوں تک پہنچایا ہے"! ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ اتنے میں کچھ جرمن ادھر سے گزرے فرشتے نے انہیں دیکھا تو روکا اور کہا "یہ شخص اپنا نام ہٹلر بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں جرمن قوم کا ہیرو ہوں کیا یہ درست ہے"؟ انہوں نے حقارت سے ہٹلر کو دیکھا اور کہا "یہ شخص غلط بیانی سے کام لے رہا ہے، اس نے جرمن قوم کو برباد کیا ہے، یہ ہمارا ہیرو نہیں ہے" ہٹلر نے یہ سنا تو مزید آگ بگولا ہو گیا اور غصے سے کانپتے ہوئے بولا "یہ بکواس کر رہے ہیں، تم ان کی باتوں پر نہ جاؤ، میرے دور کے جرمن اخبار منگواؤ اور دیکھو کہ میرے بارے میں وہ کس طرح رطب اللسان رہے ہیں"!

ظاہر ہے یہ سب سکرین بیوٹی کے کرشمے ہیں اور لوگ اس جھانسے میں آ جاتے ہیں البتہ ایک داروغہ جنت ہے جو سکرین بیوٹی پر نہیں جاتا۔ پس ثابت ہوا کہ ہم نے اپنی تصویر پر عائد ہونے والا آخری الزام بھی رد کر دیا ہے اب قارئین کو اس سلسلے میں اپنی زبانیں بند رکھنی چاہئیں اور سکرین بیوٹی ہی کو اصل بیوٹی سمجھنا چاہیئے!

۲۷ مارچ ۱۹۷۷ء

ایک اور آزاد اُمیدوار!

گزشتہ روز ہماری ملاقات ایک اور آزاد امیدوار سے ہوئی ہے ان کا اسم گرامی حاجی کیپٹن امیر علی خاں ریٹائرڈ بی اے ایل ایل بی ہے اور یہ صوبائی حلقہ نمبر ۴ سے آزاد امیدوار تھے۔ ان کا انتخابی نشان گھوڑا تھا۔ انہوں نے ملاقات پر ہمیں کارڈ عطا کیا۔ جس پر ان کی اور گھوڑے کی تصویر ساتھ ساتھ چھپی ہے گھوڑے کے نیچے گھوڑا لکھا ہوا ہے اور ان کی تصویر کے نیچے حاجی کیپٹن امیر علی خاں ریٹائرڈ بی اے ایل ایل بی درج ہے کیپٹن صاحب نے فیلٹ ہیٹ پہنا ہوا ہے۔ گھوڑا ننگے سر ہے۔ کیپٹن صاحب تصویر میں ساکت نظر آرہے ہیں جبکہ گھوڑا متحرک دکھائی دیتا ہے اسی طرح کیپٹن صاحب تصویر میں خاصے پراُمید دکھائی دے رہے ہیں جب کہ گھوڑے کے تاثرات زیادہ واضح نہیں ہیں البتہ اس کی دُم اوپر کو اٹھی ہوئی ہے یہ کارڈ دو رنگوں میں شائع کیا گیا ہے کیپٹن صاحب کی تصویر سبز رنگ میں ہے اور گھوڑا سرخ ہے جبکہ کارڈ کی بیک گراونڈ سفید ہے۔ ان سبز، سرخ اور سفید رنگوں سے ہم نے ایک نتیجہ یہ نکالا ہے کہ کیپٹن صاحب کے نزدیک حالیہ انتخابی معرکہ سبز اور سرخ کا معرکہ تھا اور سفید بیک گراونڈ سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ووٹروں کا خون سفید ہو گیا ہے کیونکہ اس سبز اور سرخ معرکے میں اس "آزاد" امیدوار کو ۶۵ ووٹ ملے ہیں!

لیکن اگر ہم نے صرف کیپٹن صاحب کا کارڈ دیکھا ہوتا اور ان سے شرف ملاقات حاصل نہ ہوتا تو ہم ان کی شخصیت کا اندازہ ان اشاروں کنایوں سے لگاتے جو ان کے

شائع کردہ کارڈ سے ملتے ہیں اور جن کا ذکر ہم نے اوپر کی سطور میں کیا ہے اس سے ہم ان کی شخصیت کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو سکتے تھے لیکن ان سے ملاقات کے بعد ہمارا تاثر قدرے مختلف ہے کیپٹن صاحب خاصی خوشگوار شخصیت کے مالک ہیں اور انہیں شعروشاعری کا بھی "ٹھرک" ہے تصویر میں تو وہ ٹائی اور کوٹ میں ملبوس ہیں اور سر پر فیلٹ بھی نظر آرہا ہے مگر جب ہماری ان سے ملاقات ہوئی وہ عوامی قسم کے شلوار کرتے میں ملبوس تھے حالانکہ اس سے الٹ ہونا چاہیئے تھا ہم نے دورانِ گفتگو ان کے ہارنے کی وجہ نہیں پوچھی ۔ بلکہ "بعد از مرگ واویلا" کے طور پر صرف یہ مشورہ دیا کہ انتخابی سرگرمیوں کے دوران انہیں اپنا انتخابی سلوگن اقبال کا یہ شعر بنانا چاہیئے تھا ۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

اس میں مصلحت یہ تھی کہ ایک تو عوام کو یہ باور کرایا جاتا کہ ہر طرف "ظلمت" کا دور دورہ ہے اور دوسری طرف اس رگڑے میں کیپٹن کا انتخابی نشان "گھوڑا" بھی عوام کو ازبر ہو جاتا ۔ مگر کیپٹن صاحب ہماری یہ بات سن کر ہنسے اور بولے "بادشاہو! یہ شعر تو پرانا ہو گیا ہے ہم نے تو انتخابات کے لیے خصوصی شعر تیار کئے تھے مثلاً یہ شعر ملاحظہ کیجیے ۔

تصویرِ وفا گھوڑا ، الفت کی زباں گھوڑا
ہے مردِ مجاہد کی ہمت کا نشاں گھوڑا ۔

ہم نے اس پر داد دی تو بولے یہ تو کچھ بھی نہیں ، دو شعر اور سنیئے

دشمن کے ٹھکانوں پر ہے پہنچا کام اس کا
بارش میں بھی تیروں کی رہتا ہے رواں گھوڑا
ہے کبھی براق یہی دلدل ہے کبھی یہ ہی
ہو معرکۂ کربل تو حق کا نشاں گھوڑا

انہوں نے گھوڑے کی شان میں ان مدحیہ اشعار کے علاوہ نثر میں بھی خاصی گفتگو کی اور خاصی تفصیل سے بتایا کہ گھوڑے کو کس کس سلسلے میں کیا کیا فوقیت حاصل ہیں تاہم ہم نے

کامن سینس سے یہ اندازہ لگایا کہ کیپٹن صاحب گھوڑے کے لیے اس قدر رطب اللسان الیکشن کے بعد ہی نظر آرہے ہیں ورنہ انتخابی مہم کے دوران انہوں نے یقیناً گھوڑے کی بجائے اپنے اوصاف ہی بیان کئے ہوں گے کیونکہ گھوڑے کی جو صفات وہ بیان کر رہے تھے وہ اس قدر ٹھوس اور قائل کرنے والی تھیں کہ اگر کیپٹن صاحب نے اپنی انتخابی مہم کے دوران انہیں موضوع گفتگو بنایا ہوتا تو ممکن ہے وہ خود انتخاب ہار جاتے (جو وہ اس کے باوجود ہار گئے ہیں) مگر ہمیں یقین ہے گھوڑا انتخاب جیت جاتا اور اگر یہ گھوڑا انتخاب جیت جاتا تو آج اس کا شمار بھی عوامی نمائندوں میں ہوتا نہ صرف یہ کہ اس کا شمار عوامی نمائندوں میں ہوتا بلکہ یہ گھوڑا آج دیگر نمائندوں کے ساتھ اسمبلی کی گھاٹ پر پانی پی رہا ہوتا۔

۳۰ مارچ ۱۹۷۷ء

میں نہ بولی!

ایک خبر کے مطابق گزشتہ روز حیدرآباد میں خواجہ سراؤں (ہیجڑوں) نے بھی احتجاجی جلوس نکال دیا ہے۔ خواجہ سراؤں نے یہ جلوس نگینہ نامی خواجہ سرا کی قیادت میں ہیرآباد سے نکالا جو روپ محل مارکیٹ اور تلک چاڑی کا چکر لگاتا ہوا عامل کالونی پر ختم ہوا۔ خواجہ سرا اس احتجاجی جلوس کے دوران ڈھولک پر یہ گیت گا رہے تھے۔

ایوب آیا	میں نہ بولی
یحیٰی آیا	میں نہ بولی
بھٹو آیا	میں نہ بولی
دوبارہ آیا	تو میں بولی

چلاؤ گولی
چلاؤ گولی

یہ خبر روزنامہ حریت میں شائع ہوئی ہے اور جب سے ہم نے یہ خبر پڑھی ہے، بار بار آنکھوں کے سامنے جلوس کا منظر لاتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں یہ منظر کچھ اس طرح کا ہوگا کہ خواجہ سرا نگینہ کے نعروں کے جواب میں دیگر خواجہ سرا لکر لچکا لچکا کر "میں نہ بولی" کہتے ہوں گے۔ اور پھر تالیاں بجا بجا کر "چلاؤ گولی"، "چلاؤ گولی" کی تکرار کرتے ہوں گے۔ خبر میں یہ نہیں بتایا گیا کہ ہیجڑوں کے اس جلوس کے ساتھ پولیس

بھی تھی یا نہیں ؟ کیوں کہ لاہور میں صحافیوں نے جو جلوس نکالا تھا۔اس کے ساتھ پولیس نہیں تھی۔ خبر سے یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہیجڑوں کی طرف سے "چلاؤ گولی" کے مطالبے کی شنوائی ہوئی کہ نہیں کیونکہ حکومت کی مشینری ان دنوں عوام کا ہر مطالبہ ماننے کے لئے ہمہ وقت تیار نظر آتی ہے۔ خبر میں ایک تشنہ پہلو یہ بھی ہے کہ خواجہ سرا جلوس میں صرف ڈھولکے کی تھاپ پر احتجاج کر رہے تھے یا ان فن کاروں نے احتجاجی بینر بھی اٹھائے ہوئے تھے اور اگر انہوں نے بینر اٹھائے ہوئے تھے تو ان کی عبارت کیا تھی ؟ ہمارا خیال ہے اگر جلوس میں کوئی بینر تھا تو وہ صرف اس عبارت پر مشتمل ہوگا کہ "اسمبلیوں میں ہیجڑوں کو باقاعدہ نمائندگی دی جائے"۔ تاہم یہ محض مفروضہ ہے اور محض مفروضوں کے بل پہ بات آگے نہیں نہیں بڑھائی جا سکتی۔ اصل چیز تو وہ جلوس ہے۔ جو خواجہ سراؤں نے نکالا ہے یا وہ احتجاجی گیت ہے جو دوران جلوس وہ ڈھولک کی تھاپ پر گاتے رہے ہیں اور ہم یہی منظر بار بار آنکھوں کے سامنے لاتے اور محظوظ ہوتے ہیں۔

ان تمام امور سے قطع نظر کرنے کے باوجود ہمارا دھیان ایک اور مسئلے کی طرف چلا گیا ہے جو خاصا اہم ہے مسئلہ یہ ہے کہ حیدر آباد میں نکلنے والے ہیجڑوں کے جلوس کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے تھا یا یہ لوگ بطور فری لانسر سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ یہ سوال اس لئے اہم ہے کہ اگر یہ جلوس حیدر آباد کے ہیجڑوں نے رضا کارانہ طور پر نکالا تھا تو بھی کسی دوسرے شہر سے تصویر کا دوسرا رُخ سامنے آنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ جلوس بہر حال اپوزیشن کی حمایت میں معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ اب ہیجڑے تک میدان میں نکل آئے ہیں۔ چنانچہ اب ایک جلوس حکومت کے ہم نوا ہیجڑوں کا بھی نکلنا چاہیئے اور اس جلوس کے دوران انہیں بھی ڈھولک پر قدرے ترمیم کے ساتھ یہی گیت گانا چاہیئے ؎

ایوب آیا — میں نہ بولی
یحییٰ آیا — میں نہ بولی
بھٹو آیا — میں نہ بولی
دوبارہ آیا — میں نہ بولی

کھلاؤ گولی کھلاؤ گولی !

اور اس موقع پر مطالبے کی فوری منظوری کے لئے جلوس کے شرکا میں بی پی کی میٹھی گولیاں

تقسیم کی جانی چاہئیں۔

۷/اپریل ۱۹۷۷ء

افادیت

کچھ چیزوں کے ساتھ کچھ چیزیں ضرور آتی ہیں۔ مثلاً بھینسوں کے کے ساتھ جوہڑ آتا ہے۔ پاتھیاں آتی ہیں اور وڑیوزیں (بنولا) آتے ہیں، مونچھوں کے ساتھ قینچی آتی ہے اور "مساوات" قائم کرتے کرتے قینچی باقی رہ جاتی ہے مونچھیں صاف ہو جاتی ہیں۔ ہم یہ سب تجربے کر بیٹھے ہیں۔ بچپن میں گھر والوں نے ایک بھینس پالی تھی جس کی نگرانی کا کام ہمارے سپرد کیا گیا تھا۔ جوہڑ، پاتھیوں اور وڑیوؤں سے تنگ آکر ایکدن ہم نے الٹی میٹم دے دیا اور کہا "اس گھر میں ہم رہیں گے یا یہ بھینس رہے گی!" یہ سن کر گھر والوں نے دو تین منٹ تک آنکھیں بند کرکے غور و خوض کیا اور پھر فرمایا "بھینس رہے گی!" خود ہمیں اس فیصلے میں خاصی معقولیت دکھائی دی۔ کیونکہ ہم دودھ نہیں دیتے تھے۔ گوجروں (اور اہالیانِ گوجرانوالہ) کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ صورتِ حال ابھی تک جوں کی توں ہے۔ کسی زمانے میں ہم نے مونچھیں بھی رکھی تھیں۔ اور ان مونچھوں کے ساتھ قینچی بھی گھر میں چلی آئی۔ مگر "مساوات" کے چکر میں پڑکر یہاں بھی مونچھوں ہی کو گھر نکالا دینا پڑا۔ اب ہمارے پاس مونچھیں ہیں اور نہ قینچی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی پر رونا آتا ہے۔

۸/دسمبر ۱۹۷۶ء

دِل بہت اُداس ہے!

اُداس ہونا بھی ایک خوبصورت عمل ہے۔ انسان زندگی کی گہماگہمی اور ایک جیسی خوشیوں اور مسرتوں کے ملبے میں دبا ہوا کسی لمحے محسوس کرتا ہے کہ ہلکے رنگوں والی اُداسیاں اس میں سرایت کر رہی ہیں۔ یہ اداسیاں پس منظر میں سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کی طرح ہوتی ہیں۔ جو ساحل تک پہنچتے پہنچتے ننھے منے بچے کی طرح پاؤں سے لپٹ جاتی ہیں۔ یہ اُداسیاں سرما کی چاندنی کی طرح ہوتی ہیں جس کی کرنیں گم سُم فضاؤں میں دبے پاؤں اترتی محسوس ہوتی ہیں۔ ان اداسیوں میں ان پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ ہوتی ہے جو گرمیوں میں آدھی رات کو مکان کی چھتوں پر سوئے ہوئے انسانوں کے سروں سے گذرتے ہیں۔ یہ اُداسیاں اتوار کے دن زندگی کے ہنگاموں سے خالی سونی رہگذاروں کی طرح ہوتی ہیں اور ان اداسیوں میں بارش کے بعد کچے مکانوں اور مٹی سے اُٹھنے والی سوندھی سوندھی خوشبو کی گھلاوٹ ہوتی ہے۔

اداس ہونا ایک خوبصورت عمل ہے۔ مگر اداسیوں کے بہت روپ ہوتے ہیں۔ ان میں سے خوبصورت روپ وہی ہے جو فرد کے اندر نامعلوم بحران سے اپنا چہرہ استوار کرتا ہے اور جو ایک جیسی چیزیں دیکھتے دیکھتے کسی ایک نادیدہ مقام پر حیرت کے عالم میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگر اداسی کا ایک روپ دل گرفتگی کا روپ ہے۔ یہ اداسی زہر کی طرح ذہنوں میں سرایت کرتی ہے اور ایک سے دوسرے ذہن میں منتقل ہوتی ہے۔ یہ اداسی سمندر کی بپھری ہوئی موج کی طرح آتی ہے اور سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتی ہے۔ اداسی کا یہ چہرہ تیروں سے چھلنی ہوتا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی فضا کربلا کے

میدان میں اہلِ بیت کے خیموں سے اٹھنے والی عورتوں اور بچوں کی آہ و بکا سے ترتیب پاتی ہے۔ یہ اداسیاں سوا نیزے پر آئے ہوئے سورج کی ترچھی کرنوں کی طرح دِل میں اترتی ہیں اور ان اداسیوں میں خون کی مہک رچی ہوتی ہے۔

میں بہت اداس ہوں۔ میرا چہرہ تیروں سے چھلنی ہے اور میری اداسیوں میں خون کی مہک رچی ہوئی ہے۔ اداسیاں دِل کو ہرے ہرے مسل رہی ہیں۔ آنسو آنکھوں کی دہلیز تک آتے ہیں اور واپس لوٹ جاتے ہیں میں پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا ہوں تاکہ دِل کا غبار نکل جائے اور میں پھر سے زندگی کی مسرتوں میں شریک ہو جاؤں۔ مگر آنسو دہلیز سے لوٹ جاتے ہیں۔ میری آنکھیں آبشار نہیں بنتیں کہ میں اس آواز میں کھو نہ جاؤں میں رونا چاہتا ہوں اور اس کے لئے میدانِ کربلا میں اپنی آنکھیں اور کان چھوڑ آتا ہوں۔ کانوں میں معصوم علی اکبر اور علی اصغر کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ زینب کے نوحے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اترتے ہیں۔ آنکھیں سینوں میں بھالے اترتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔ سروں پر سے دوپٹے اتارے جا رہے ہیں۔ اور چادریں نوچی جا رہی ہیں خیموں کی طنابیں کاٹ دی گئی ہیں۔ سورج سوا نیزے پر ہے اور زبانیں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں۔ میں یہ سب منظر اپنی آنکھوں میں اتارتا ہوں۔ ساری آوازیں کانوں میں محفوظ کرتا ہوں اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا ہوں۔ مگر میری آنکھیں بنجر زمینوں کی طرح خشک ہو گئی ہیں۔ میرے دل کا غبار نہیں نکلتا کہ میں زندگی کی مسرتوں میں شریک ہو سکوں۔ میں بہت اداس ہوں اور میری اداسی شاید زہر کی طرح ہے جو ذہن میں سرایت کر گئی ہے۔ سمندر کی بپھری ہوئی موج کی طرح ہے جو سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گی!

۱۱ر اپریل ۱۹۷۷ء

(۹ر اپریل کو لاہور میں کھیلے جانے والے خونیں ڈرامے پر)

قادر الکلام

یہ قادر الکلام کا لفظ ہم نے پہلی بار ایک مرحوم شاعر کے بارے میں شائع شدہ تعزیتی مضمون میں پڑھا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ مرحوم بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ تب ہم نے قادر الکلام کے معنی جانے اور معلوم ہوا کہ قادر الکلام اسے کہتے ہیں جسے کلام پر قدرت حاصل ہو۔ یعنی وہ جو بات بھی کہنا چاہے پوری مہارت سے کہہ ڈالے۔ اس لفظ کے معنی کھلنے کے بعد ہم پر ظاہر ہوا کہ قادر الکلام صرف شاعر ہی نہیں غیر شاعر بھی ہو سکتا ہے اور پھر ہماری ملاقات پے در پے ایسے لوگوں سے ہوئی جنہیں واقعی "کلام" پر "قدرت" حاصل تھی۔ اور ملاقاتوں یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

ایک قادر الکلام تو خود ہمارے ایک دوست ہیں۔ وہ آج کل سارا دن یہ ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں کہ ملک میں مکمل طور پر امن و امان ہے۔ اور راجہ اور پرجا دونوں چین کی بانسری بجا رہے ہیں۔ ہم انہیں کہتے ہیں صورتِ حال یہ نہیں ہے جو وہ بیان کر رہے ہیں۔ وہ دیکھو شہر میں چاروں طرف سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ یہ سن کر وہ قہوہ خانے کی کھڑکی سے سر باہر نکالتے ہیں۔ دھوئیں کے گہرے مرغولے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں "کوئی ایسی بات نہیں بہت سارے لوگ مل کر کہیں سگریٹ پی رہے ہوں گے۔"

اس قسم کے قادر الکلام صرف افراد ہی میں نہیں پائے جاتے بلکہ ہمارے ہاں قادر الکلامی کے باقاعدہ ادارے موجود ہیں جن میں سے ریڈیو، ٹی وی اور ٹرسٹ کے اخبارات سرِفہرست ہیں ہم نے ایک گزشتہ ہڑتال کے اگلے روز ٹرسٹ کے ایک مقامی اخبار میں ایک تصویر دیکھی جو گوجرانوالہ کے

کسی بازار کی تھی۔ اس کے نیچے لکھا تھا:

" کشمیری بازار کھلا ہے۔"

اور اہالیان گوجرانوالہ کا کہنا ہے کہ گوجرانوالہ میں کشمیری بازار کے نام سے سرے سے کوئی بازار ہی نہیں ہے بلکہ تصویر میں جو بازار دکھایا گیا ہے نام سے قطع نظر وہ گوجرانوالہ میں واقع ہی نہیں ہے۔ کیونکہ بقول ان کے اگلے روز یہی تصویر سیالکوٹ میں فلاں بازار کھلا ہے، کی کیپشن کے ساتھ اسی اخبار میں شائع ہوئی تب ہم نے پوچھا کہ اگر گوجرانوالہ میں سرے سے کوئی کشمیری بازار ہے ہی نہیں تو ایسی تصویر شائع کرنے کا مقصد کیا تھا۔ بولے گوجرانوالہ سے حزب اختلاف کی طرف سے قومی اسمبلی کے لئے منتخب ہونے والے رکن جناب غلام دستگیر اتفاقاً کشمیری برادری سے تعلق رکھتے ہیں چنانچہ یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ خود کشمیری برادری بھی ان کے ساتھ نہیں ہے اور یہ ثابت کرنے کے لئے عام ہڑتال کے روز "کشمیری بازار"، کھلا دکھایا جانا انتہائی ضروری تھا۔

رہا معاملہ ریڈیو اور ٹی وی کی قادر الکلامی کا تو یہ ادارے بھی پوری "مہارت"، کے ساتھ اپنے کلام بلاغت نظام سے عوام کو نوازتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اگر کسی شخص کو کچھ عرصہ کے لیے ایک کمرے میں بند کر دیا جائے اور اسے پڑھنے کے لئے ٹرسٹ کے اخبارات، سُننے کے لئے ریڈیو اور دیکھنے کیلئے ٹی وی "سپلائی" کیا جائے اور اس کے بعد ایک دن اچانک اسے اس کمرے سے نکال کر شہر کے گلی کوچوں کی سیر کرائی جائے تو وہ خود کو اصحاب کہف میں سے سمجھے گا اور آنکھیں ملتے ہوئے حیرت کے ساتھ "بدلے"، ہوئے مناظر دیکھے گا۔ ظاہر ہے یہ سب قادر الکلامی کے کرشمے ہوں گے۔ مگر وہ جو "اصحاب کہف"، میں سے نہیں ہیں۔ انہوں نے تو ریڈیو سے اپنی گھڑیاں ملانا بھی بند کر دی ہیں۔

سو ہم نہیں جانتے یہ قادر الکلام حضرات اور ادارے کبوتر کیطرح آنکھیں بند کر کے بلی کیلئے رستہ ہموار کرتے ہیں یا اپنے کرم فرماؤں کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ قادر الکلام کا لفظ ہم نے پہلی بار ایک تعزیتی مضمون میں پڑھا تھا اور یوں ہمارے ذہن میں اس لفظ کے ساتھ جو تصور وابستہ ہے۔ وہ بھی خاصا تعزیتی قسم کا ہے۔

۱۴ر اپریل ۱۹۷۷ء

ہیرو، کامیڈین اور اب[صا] ولن !

ہم نے پاکستان کی فلم انڈسٹری میں کچھ فن کاروں کو بتدریج ہیرو سے کامیڈین اور کامیڈین سے ولن کے روپ میں آتے دیکھا ہے اور عبرت پکڑی ہے۔ یہ لوگ پردہ سکرین پر ہیرو کی حیثیت سے نمودار ہوئے مگر کچھ عرصہ بعد عوام نے انہیں بطور ہیرو مسترد کر دیا۔ چنانچہ انہیں پردہ سکرین پر رہنے کیلئے کامیڈین کا رول ادا کرنا پڑا اور آخر میں عوام جب ان کے اس روپ سے بھی بیزار ہو گئے تو خود نمائی کے شوق میں وہ سب کچھ بھلا کر ولن بن گئے۔ ان میں سے ایک اسلم پرویز ہیں جو بفضلِ تعالیٰ بقید حیات ہیں اور "حیات" کے ساتھ "قید" کا لفظ غالباً ایسے فن کاروں ہی کے لیے لغات میں آیا ہے جنہیں ان کی زندگی ہی میں لوگ ہیرو کی بجائے ولن کے روپ میں دیکھنے لگتے ہیں۔

اسلم پرویز نے فلم انڈسٹری میں بطور ہیرو قدم رکھا تو عوام کے ایک بڑے طبقے نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس میں کچھ دخل ان کی تقدیر کو بھی تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ کچھ عرصہ کے لیے بطور ہیرو اسٹیبلش ہو گئے اس دوران انہوں نے حزنیہ اور طربیہ دونوں کردار کامیابی سے ادا کئے اور ایسے مناظر میں ناظرین کو یہ احساس تک نہ ہونے دیا کہ وہ اداکاری کر رہے ہیں چنانچہ وہ عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئے اور ایک عرصے تک بطور ہیرو پردہ سکرین پر نمودار ہوتے رہے

مگر کچھ ہی عرصہ بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ جسے ہیرو سمجھ رہے ہیں، وہ ہیرو کی بیشتر صفات سے محروم ہے اس کی چال ڈھال، وضع قطع اور کردار ہیرو سے مماثلت نہیں رکھتا۔ چنانچہ

صا (اشارہ اس وقت کے وزیرِ اعظم کی طرف نہیں ہے، نوٹ فرمالیں !)

عوام نے انہیں ناپسند کرنا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجے میں وہ فلمیں بھی یکے بعد دیگرے فلاپ ہوتی چلی گئیں جن میں عوامی ناپسندیدگی کے باوجود اسلم پرویز کو بطور ہیرو پیش کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آیا جب لوگوں نے انہیں پردۂ سکرین پر ہیرو کے روپ میں دیکھ کر ان پر آوازے کسنے شروع کر دیئے اور صورت حال اس حد تک مخدوش ہو گئی کہ اسلم پرویز کو ہیرو کا رول چھوڑ کر فلموں میں جزوی طور پر کامیڈین کے رول ادا کرنے پڑے۔ عوام نے کچھ دیر تک انہیں اس رول میں پسند کیا اور پھر بطور کامیڈین بھی وہ ناکام ہو گئے

مگر شوقِ خود نمائی کچھ ایسا شوق ہے کہ انسان اس کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے، چنانچہ اسلم پرویز نے جو بھلے وقتوں میں ہیرو کا رول ادا کرتے تھے، پردۂ سکرین پر موجود رہنے کے لیے ولن کا روپ دھارا اور اب پاکستان فلم انڈسٹری کے وہ انتہائی نمایاں ولن ہیں۔ قریباً ہر فلم میں وہ ایک ناپسندیدہ شخصیت کے کردار میں سامنے آتے ہیں، جس کے گرد خوشامدیوں کا ہجوم ہے اور جس کے کارندے بستی میں لوٹ مار میں مشغول رہتے ہیں۔ تین چوتھائی فلم میں ان کی دہشت سے علاقے کے لوگوں کو لرزاں و ترساں دکھایا جاتا ہے۔ مگر آخر میں فلم کا ہیرو انہیں پوری طرح زیر کر لیتا ہے عوام اسلم پرویز کو اس کردار میں دیکھتے ہیں تو مغلظات کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں مگر اسلم پرویز کو اس سے کوئی غرض نہیں کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک منجھے ہوئے فن کار ہیں۔ انہیں ہر صورت میں پردۂ سکرین پر رہنا ہے خواہ اس کے لئے انہیں ہیرو کا رول ادا کرنا پڑے یا ولن بننا پڑے۔

تاہم اسلم پرویز کے لیے ہمارا ایک مخلصانہ مشورہ ہے اور وہ یہ کہ انہیں ابھی سے اپنے بہتر مستقبل کے بارے میں سوچ رکھنا چاہیئے اور اب کوئی کیریکٹر رول ادا کرنے کی فکر کرنی چاہیئے کیونکہ ہماری فلم انڈسٹری میں ولن کا کردار ناپائیدار ہوتا ہے، اسے اتنی بڑکیں مارنا پڑتی ہیں کہ جلد ہی اس کا گلا بیٹھ جاتا ہے جس کے باعث کچھ عرصہ بعد وہ ولن کا کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پردۂ سکرین سے سے غائب ہو جاتا ہے ماضی قریب میں مظہر شاہ بظاہر کامیاب ترین ولن تھا مگر بڑکیں لگا لگا کر اس کا حلق بیٹھ گیا اور اب وہ کہیں نظر نہیں آتا۔

۱۸ اپریل ۱۹۷۷ء

لہور، لہور اے

جس کسی نے بھی کہا ہے "لہَور، لہَور اے" (لاہور لاہور ہے) ٹھیک ہی کہا ہے۔ یہ شہر من موجی لوگوں کا شہر ہے، چنانچہ لاہوریئے جس شوق میں ایک بار مبتلا ہو جائیں، پھر اسے تکمیل تک پہنچا کر دم لیتے ہیں، مثلاً اگر انہیں پتنگ بازی کا شوق چرایا ہے تو تیز ہواؤں کے مقابل پتنگ چڑھا دیتے ہیں اور انگلیاں فگار کر بیٹھتے ہیں، پیچ لڑانے کا شوق ابھرے تو ذرا سی ڈور کے ساتھ "کسی" رسی دراز" پتنگ سے پیچا جا لڑاتے ہیں، ڈور ختم ہونے کو آئے تو پیچھے دھاگہ باندھ لیتے ہیں اور دھاگہ بھی ختم ہونے کو ہو تو ڈور کا سرا ہاتھ میں پکڑے پتنگ کے ساتھ ساتھ بھاگنا شروع کر دیتے ہیں اور واقعی شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا!

یہ شہر بہت انتہا پسند ہے، پیار بھی بہت کرتا ہے اور نفرت بھی بہت کرتا ہے یہاں ہم نے لیڈروں کو ہر دو صورتوں میں دیکھا، مثلاً کچھ اس طرح کہ آگے لیڈر ہے اور پیچھے عوام ہیں۔ اور اس طرح بھی کہ "آگے آگے" لیڈر ہے اور "پیچھے پیچھے" عوام ہیں، یعنی لاہوریئے ہر دو صورتوں میں لیڈروں کے پیچھے چلتے ہیں، بس اتنا ہے کہ کبھی جاں بکف اور کبھی سنگ بکف ہوتے ہیں

لاہوریوں میں ایک بات اور بہت دلچسپ ہے، اگر آپ کبھی صبح کے وقت اندرونِ لاہور کا ایک چکر لگائیں اور انہیں حلوہ پوری، سری پائے یا نہاری وغیرہ کی دکانوں پر مصروفِ ناشتہ دیکھیں یا ناشتے کا سامان خریدتے پائیں، اسی طرح انہیں دوپہر شام یا رات کو اشیائے خورد و نوش کے ساتھ "دست درازیاں" کرتے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارا ملک ابھی تک خوراک

کے معاملے میں خود کفیل کیوں نہیں ہو سکا ؟ اس کے نتیجے میں آپ کا تاثر یہی ہو گا کہ لاہوریوں کو کھانے پینے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ، اسی طرح شام کو کسی سینما کے باہر لگی طویل قطاروں کو دیکھ کر ایک تاثر یہ ابھرے گا کہ لاہور والوں کو دنیا میں اگر کوئی چیز عزیز ہے تو وہ غالباً صرف فلم ہے جمعہ کے روز مساجد کی کیفیت دیکھیں تو احساس ہو گا کہ یہ نمازی پرہیز گاروں کا شہر ہے اور اگر آپ انہیں لڑائی مار کٹائی کرتے دیکھ لیں ، تو اس شبہے میں مبتلا ہو جائیں گے کہ یہ لاہور نہیں غالباً ہالی وڈ کی کسی ایکشن فلم کا کوئی سیٹ ہے۔

لاہوریوں میں موجود تضادات میں سے ایک تضاد یہ بھی ہے کہ یہ امرتسر ٹیلیویژن سے بھارتی فلم کچھ اس اہتمام سے دیکھتے ہیں گویا کارِ ثواب ہے۔ جس روز فلم لگنی ہو، اس روز سرِ شام اپنے مکانوں کی چھتوں پر انٹینے ٹھیک کرتے نظر آتے ہیں ، تمام کام کاج چھوڑ کر فلم کے وقت گھر پہنچ جاتے ہیں فلم کے دوران اگر تصویر میں کوئی گڑ بڑ واقع ہو جائے تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں ، مگر دوسری طرف انہیں دنیا میں اگر کسی سے نفرت ہے تو وہ بھارتی حکمرانوں سے ہے چنانچہ سیاست کے ضمن میں بھی ان کی نفرتیں اور محبتیں اسی حوالے سے استوار ہوتی ہیں جو لیڈر انڈیا کے سامراجی عزائم کا دشمن ہے وہ ان کا محبوب ہے اور جو اس سے منحرف ہو ، وہ اسے ذاتی دشمن سمجھنے لگتے ہیں !

لاہور کو زندہ دلوں کا شہر کہا جاتا ہے اور یہ اس لیے کہ یہاں کے لوگ واقعی بہت زندہ دل ہیں ، صبح شام مکان کے تھڑوں پر بیٹھ کر گپ شپ کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے نوک جھونک کرتے ہیں اور ہنستے بھی ہیں ، کھیل تماشوں کے رسیا ہیں چنانچہ جہاں ڈگڈگی کی آواز سنتے ہیں جمع ہو جاتے ہیں شام کو لکشمی چوک میں چمپی کراتے ہیں ، کانوں کی میل نکلواتے ہیں ، نو سے بارہ کا شو دیکھتے ہیں اور پھر رات کو دیر سے سوتے ہیں ، جس کے نتیجے میں بیدار بھی دیر سے ہوتے ہیں یہ شہر دیر سے بیدار ہوتا ہے اور پھر دیر تک جاگتا ہے ۔ !

۱۱ مئی ۷۷ء

لوہے کا جال

گزشتہ دنوں جب کرفیو لگا تو ہم لاہور سے باہر تھے، واپس آئے تو کرفیو اٹھا لیا گیا تھا۔ یار دوستوں سے کرفیو کے بارے میں رومان انگیز باتیں سنیں تو اپنے کالم میں کرفیو کے مناظر سے محرومی کا ذکر کر بیٹھے اور غلطی سے "مکرر ارشاد" کہہ دیا، ہم نہیں جانتے تھے کہ ہماری بات کو اتنا وزن دیا جاتا ہے، سو دوسرے تیسرے دن کرفیو دوبارہ لگا دیا گیا جو تادم تحریر جاری ہے ایک زائر نے وطن سے دُور رو رو کر دعا مانگی کہ اے خدا مجھے اگر موت آنی ہے تو یہیں آئے تاکہ میری قبر اس مقدس شہر میں بنے یہ وقت غالباً دعا کی قبولیت کا وقت تھا! کیوں کہ کچھ ہی دنوں بعد وہ زائر بیمار پڑ گیا حتیٰ کہ بستر سے لگ گیا جب اس پر نزع کا عالم طاری ہوا، تو اس نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "یا خدا! دعائیں تو میں نے اور بھی بہت سی مانگی تھیں!" سو ہم بھی ان دنوں بار بار آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور بیچارگی سے کہتے ہیں کہ "یا خدا، دعائیں تو ہم نے اور بھی بہت سی مانگی تھیں!"

یہ داویلا ہم یوں کر رہے ہیں کہ کرفیو کی وجہ سے ہماری سرگرمیاں محدود بلکہ مسدود ہو کر رہ گئی ہیں، سرگرمیاں یہ تھیں کہ صبح سے شام تک بلا مقصد سڑکوں پر آوارہ گردی اور ٹی ہاؤس میں بے مقصد گفتگو کرتے تھے جب رات گئے گھر لوٹتے تھے تو اپنے آپ سے یہ پختہ وعدہ کرتے تھے کل سے گھر وقت پر آئیں گے، دوپہر کا کھانا چولہے کے پاس پیڑھی بچھا کر کھائیں گے تاکہ توے سے اترتی ہوئی گرم گرم اور پھولی پھولی روٹیوں کا جو ذائقہ زبان سے محو ہو چکا ہے، وہ عود کر آئے کھانے

کے بعد قیلولہ کا تجربہ کریں گے تاکہ اس کے فوائد سے آگاہ ہو سکیں۔ اس کے بعد شام کو کھانے سے فراغت کے بعد چہل قدمی بھی کر کے دیکھ لیں گے جس کے بارے میں ڈاکٹر لوگ روزِ ازل سے رطب اللسان نظر آتے ہیں چہل قدمی کے بعد ہم اپنے مکان کے برآمدے میں میز کرسی بچھا کر ٹیبل لیمپ جلا کر اپنی زیر ترتیب کتابوں کے ادھورے مسودے مکمل کریں گے اور پھر سونے سے پہلے ان سینکڑوں کتابوں میں سے کسی ایک کو مطالعے کے لیے بستر میں لے جائیں گے۔ جنہیں ہم گاہے بگاہے جھاڑ پھونک کر الماری میں واپس رکھ دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ مطالعہ کرتے کرتے ہم کتاب سینے پر رکھ کر سو جائیں گے اور صبح جب سو کر بیدار ہوں گے تو ہمارے چہرے پر وہ شانتی نظر آئے گی جو زندگی کو ٹائم ٹیبل کے مطابق بسر کرنے سے ان چہروں پر نظر آتی ہے جن سے ہماری آشنائی نہیں ہے اس کے بعد ہم اچھے بچوں کی طرح سے

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

ہاتھ باندھ کر گائیں گے اور پھر ناشتہ کر کے دفتر چلے جائیں گے تاکہ ٹائم ٹیبل کے مطابق دوپہر کو گھر واپس آ کر کھانا کھائیں، قیلولہ کریں نیز چہل قدمی وغیرہ کر کے خود کو معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد سمجھنا محسوس کر دیں! لیکن ہوتا یوں تھا کہ ہم روزانہ یہ ارادے باندھتے تھے اور توڑ دیتے تھے۔ چنانچہ یہ قابلِ قدر عزائم اپنی جگہ برقرار رہتے تھے اور ہم پرانی ڈگر پر چلتے ہوئے سارا دن سڑکوں پر بلا مقصد آوارہ گردی اور ٹی ہاؤس میں بے مقصد گفتگو کرتے تھے۔ صبح ہوتی تھی اور زندگی یوں تمام ہوتی تھی!

اب یہ آزاد پنچھی کرفیو کے زیر دام آیا ہے، تو اس کی یہ سرگرمیاں مسدود ہو کر رہ گئی ہیں اور تمام واویلا اسی وجہ سے ہے مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ چور، چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے، سو ان دنوں میں ہم ہیرا پھیری سے باز نہیں آئے ہیں صبح نو بجے تک کرفیو کے وقفہ کے دوران ہم دوڑے دوڑے گلزار وفا چودھری کے پاس جاتے ہیں، وہاں سے خالد احمد اور نجیب احمد کو جگانے چلے جاتے ہیں اور پھر جلدی جلدی بے مقصد گفتگو کر کے بھاگنے کی کرتے ہیں تاکہ کچھ دیر سڑکوں پر بے مقصد آوارہ گردی کا نصب العین بھی پورا ہو سکے ٹھیک

۹ بجے ہم واپس گھر پہنچ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ کرفیو کی پابندی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان قابل قدر عزائم کو عملی جامہ پہنائیں، جن کے متعلق ہم کئی بار پختہ ارادہ کر چکے ہیں مگر ان میں سے صرف چہل قدمی والا عزم پورا ہوتا ہے، جو ہم اضطراب کے عالم میں اپنے گھر کے صحن میں صبح سے شام تک کرتے ہیں اس دوران کوئی ”اہلِ خانہ“ ہم سے پوچھتا ہے کہ ”توفیق“ کس حال میں ہے؟“ تو ہم کہتے ہیں ”شیر لوہے کے جال میں ہے!“ اور پھر ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں!

۱۲ر مئی ۷۷ء

کمبخت

گزشتہ دنوں ہم ایک بیگم صاحبہ کے ہاں مہمان تھے بیگم صاحبہ بہت بڑی سماجی کارکن ہیں نیز ایک عرصے سے عورتوں کے حقوق کے لیے سینہ سپر ہیں، انہوں نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ چائے بنا کر پیش کی اور معذرت کے انداز میں کہنے لگیں:۔

”ریاض پتہ نہیں کہاں مر گیا ہے ورنہ چائے کے ساتھ کچھ منگواتی۔“

بعد ازاں وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگ گئیں اور باتوں باتوں میں ایک بار پھر انہوں نے ریاض کے ”لتّے“ لینے شروع کر دیئے یہ موضوع ٹلا تو انہوں نے اپنی سماجی خدمات گنوانا شروع کیں اور درمیان میں آ کر ایک بار پھر ریاض کا ذکر چھیڑ دیا ”میں تو اس سے سخت تنگ آئی ہوئی ہوں سمجھ نہیں آتی کیا کروں؟“ ہم نے جب انہیں اس قدر تنگ دیکھا تو کہا کرنا کیا ہے، اسے نوکری سے جواب دے دیں۔ کوئی اور ملازم رکھ لیں۔

ہمارا یہ مشورہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئیں اور پھر کچھ دیر توقف کے بعد کہنے لگیں۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں لیکن میں یہ قدم فوری طور پر نہیں اٹھا سکتی!“ ہم حیران ہوئے اور پوچھا ”یہ کیوں؟“ بولیں ”ذرا دہ خواتین کو طلاق والا حق مل جائے۔ یہ ریاض کمبخت میرا شوہر ہے!“

۱۵ر نومبر ۷۶ء

"حافظ" اور "حافڑ"!

حافظ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور دوسرے جو نابینا ہوتے ہیں۔ پنجاب میں دوسرے قسم کے حافظوں کو "حافظ" کی بجائے "حافڑ" کہا جاتا ہے ہم بدقسمتی سے نہ تو حافظ ہیں اور نہ اللہ کے فضل و کرم سے "حافڑ" ہیں البتہ اس لحاظ سے ہم تھوڑے بہت حافظ ضرور ہیں کہ وہ تمام خبریں جو شہ سرخیوں کے ساتھ صبح کے اخبار کی زینت بنا ہوتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے افسروں کی مہربانی کی وجہ سے ریڈیو، ٹیلیویژن سے بار بار نشر ہونے کے سبب روزانہ رات تک ہمیں حفظ ہو جاتی ہیں اور فرمائش پر ہم وہ فر فر سنا بھی سکتے ہیں ہم نے اپنے اس فن کا مظاہرہ متعدد بار اپنے دوستوں کے سامنے پوری کامیابی کے ساتھ کیا ہے اور ان سے داد وصول کی ہے۔

ہم نے یہ داد تو وصول کی ہے مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ محض دوستوں کی دوست نوازی ہے یا متذکرہ افسروں کا کرم ہے ورنہ یہ کوئی مشکل کام نہیں بلکہ جو چاہے وہ ذرا سی محنت سے اس ضمن میں دسترس حاصل کر سکتا ہے اس کے لیے طبیعت پر تھوڑا سا جبر کرنے کی ضرورت ہے اور جبر کی صورت کچھ یوں ہے کہ ریڈیو سے علی الصبح خبروں کا پہلا بلیٹن برضا و رغبت سننے پر اکتفا نہ کریں بلکہ طبیعت پر جبر کر کے باقی آٹھ، نو بلیٹن بھی سننے کی کوشش کریں جن میں وہی خبریں بار بار دہرائی جاتی ہیں جو آپ صبح کے بلیٹن میں سن چکے ہوں گے۔ اس ریاضت کے نتیجے میں تمام خبریں نہ صرف یہ کہ آپ کو حرف بہ حرف یاد ہو جائیں گی بلکہ نیوز ریڈروں کے لہجے بھی ازبر ہو

جائیں گے لیکن اگر کوئی شخص کند ذہن ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ وہ ریڈیو کے علاوہ ٹیلی ویژن کے نیوز بلیٹن بھی سُنے جو انہی خبروں پر مشتمل ہوں گے اور اسی تکرار سے نشر ہوں گے اس کے باوجود اگر کسی شخص کا حافظہ کمزور ثابت ہوتا ہے تو وہ سزا کے طور پر ریڈیو اور ٹیلیویژن سے ان خبروں پر نشر ہونے والے آٹھ دس تبصرے بھی پورے غور سے سنے، جن میں تبصرے سے قبل سارے دن کی خبریں پوری وضاحت کے ساتھ دہرائی جاتی ہیں۔ اس نسخے پر عمل کرنے سے انشاء اللہ العزیز خبر کا ایک ایک جزو حفظ ہو جائے گا اور صبح "لازمی سروس" کے تحت شائع ہونے والے وہ اخبار پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی جو ایک بار پھر انہی خبروں کی شہ سرخیوں سے مزین نظر آئینگے

اوپر کی سطور میں ہم نے جو دعویٰ کیا ہے، وہ یونہی نہیں کیا بلکہ خدا کو حاضر ناظر جان کر کیا ہے اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا اپنے اس فن کا مظاہرہ پوری کامیابی کے ساتھ کر بھی چکے ہیں لیکن ایک دوست جو ہمارے "حافظ الخبر" ہونے کے بارے میں آگاہ نہ تھے کل ہمارے پاس آئے اور کہا "ذرا ریڈیو آن کرو! کرفیو کے اوقات معلوم کرنا ہیں"۔ ہم نے عرض کی کہ "اوقات" ہم بتائے دیتے ہیں، کہنے لگے "نہیں خبریں بھی سننی ہیں" ہم نے پیش کش کی کہ جو خبریں نشر ہوتی ہیں وہ ہم سنائے دیتے ہیں" ہنس کر بولے "چلو سناؤ!" اس پر ہم نے "عرض کیا ہے" کہہ کر خبریں سنانا شروع کر دیں "سینیٹ نے آج اتوار کی بجائے جمعہ کو . . . . دوست نے ہمیں درمیان ہی میں ٹوک دیا اور کہا "یہ خبریں صبح سے کئی بار سن چکا ہوں، کوئی نئی خبر سناؤ" ہم نے ان کی فرمائش پر دوسری خبریں سنانا شروع کر دیں مگر انہوں نے ہر بار بیچ میں ٹوک دیا کہ یہ پرانی خبر ہے اور صبح سے یہ خبر سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں"۔ ہم نے کوئی نئی خبر سنی ہوتی تو انہیں سناتے! اس دوران خبروں کا وقت ہو گیا تھا۔ دوست نے اٹھ کر ریڈیو آن کر دیا۔ خبریں نشر ہو رہی تھیں "سینیٹ نے آج اتوار کی بجائے جمعہ کو ہفتہ وار تعطیل کرنے کے بل کی منظوری دے دی۔ تمام سینیٹروں نے حکومت کے فیصلے کو سراہا اور اسے نظام مصطفےٰ کے قیام کی طرف ایک عملی قدم قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس بات کا سہرا ابھی پیپلز پارٹی کے سر ہے کہ . . . ."

سو اس روز ہمارے اس بے خبر دوست پر بھی یہ کھلا کہ ہم تھوڑی سی ریاضت کے بعد واقعی خبروں کے حافظ ہو چکے ہیں اور ظاہر ہے اس میں زیادہ کمال ہمارا نہیں ذرائع ابلاغ کے ماہرین

کا ہے جو سمجھتے ہیں کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہے، لہذا انہیں خبریں گھوٹا لگا کر یاد کرانی چاہیئں۔ عربی کا ایک مقولہ ہے جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ "علم ایک وحشی ہے جسے تکرار کے ذریعے ہی قابو میں لایا جا سکتا ہے"۔ اور ذرائع ابلاغ کے ماہر غالباً علم کو خبر سمجھتے ہیں چنانچہ وہ وحشی خبروں کی تکرار کرتے رہتے ہیں تاکہ عوام اسے قابو کر سکیں لیکن وحشی آخر وحشی ہوتا ہے اسے قابو کرنا اتنا آسان نہیں چنانچہ جو خوش قسمت اسے قابو کر لیتے ہیں، وہ "حافظ" کہلاتے ہیں اور جو بدنصیب اس وحشی کے قابو میں آ جائیں، وہ "حافظ" ہو کر رہ جاتے ہیں۔

۱۵ مئی ۷۷ء

انقلابی راگ

گدھا بہت ثقہ جانور ہے یہ کبھی نہیں ہنستا۔ گدھے کبھی نہیں ہنستے۔ گدھے کی آواز میں ایک عجیب طرح کا جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے۔ جب رات گئے یہ انقلابی راگ چھیڑتا ہے تو لوگ کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں، ہمارے ہاں انقلابی راگ اسی لے میں گائے جاتے ہیں۔

۱۹ نومبر ۷۶ء

تاریخِ رائے وِنڈ

کچھ لوگوں کو زندگی میں صرف دو ہی شوق ہوتے ہیں یعنی وہ اچھا کھاتے ہیں اور اچھا پہنتے ہیں، جبکہ ہمیں صرف ایک ہی شوق ہے اور وہ یہ کہ اچھا پڑھتے ہیں مثلاً ان دنوں ایک کتاب ہمارے ہتھے چڑھی ہوئی ہے جس کا نام "تاریخِ رائے ونڈ" ہے اور اس کے مصنف ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین ہیں جو ماشاءاللہ ایم اے انگریزی اور ایم اے اردو ہونے کے علاوہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہیں۔ ہم نے اس نادر کتاب کا مطالعہ بالاستیعاب کیا ہے بلکہ ابھی تک اس کارِ خیر میں مشغول ہیں ہم جتنا اس کتاب کے مندرجات پر غور کرتے ہیں اتنا ہی حیرت و استعجاب میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں، اور سوچتے ہیں ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی؟

اس کتاب کا آغاز جیسا کہ دستور زمانہ ہے، ایک عدد دیباچے سے ہوتا ہے جس میں مصنف نے یہ کتاب لکھنے کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے اور بڑی وجہ یہی ہے کہ "کیوں نہ اپنے علاقے کی تاریخ محفوظ کر لی جائے" تاکہ سو دو سو سال گزرنے کے بعد آنے والی نسل اپنے آباؤ اجداد کے متعلق بتا سکے کہ وہ کون تھے؟ کون سا پیشہ اختیار کرتے تھے رائے ونڈ میں آکر کیوں آباد ہوئے اور کب یہاں وارد ہوئے چنانچہ اس کے بعد مصنف نے رائے ونڈ کی تاریخ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور آخر میں یہاں کی شخصیات کا احوال درج کیا ہے کتاب کا تفصیلی جائزہ تو ہم اپنے اگلے کالم میں لیں گے پہلے ان چند شخصیتوں سے

ہم اپنے قارئین کو بھی متعارف کرائیں جن کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے تاریخ رائے ونڈ میں بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ ان تاریخی شخصیات میں سے چند ایک کا ذکر (بزبان ڈاکٹر صاحب) درج ذیل ہے۔

اللہ دتہ میاں بن فضل دین

آباؤ اجداد راجہ جنگ کے رہنے والے ہیں۔ پاکستان بننے سے قریباً آٹھ دس سال قبل رائے ونڈ میں کاروبار کے سلسلے میں آئے، یہاں آکر مانگا روڈ پر مسجد کے سامنے آٹے کی چکی، آرا مشین اور بیلنجہ لگایا۔

بدر دین بن محمد بخش بن روڑے خاں

یکم مارچ ۱۹۲۶ء کو محکمہ ریلوے میں ملازم ہوئے۔ ۱۶ اگست ۱۹۶۶ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ آج کل منڈی میں کپڑا فروخت کرتے ہیں۔

بشیر احمد بن کالے خاں

مالک بھٹی ریڈیو سروس، متصل ٹاؤن کمیٹی رائے ونڈ۔ ۱۹۵۰ء سے منڈی میں ریڈیو کی مرمت کا کام کر رہے ہیں۔

بشیر احمد بن محمد شریف

۱۹۴۳ء میں منڈی آکر کریانہ کی دکان کھولی۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء سے سبزی فروخت کرنے لگے ہیں۔

خلیل احمد شیخ بن محمد حسین۔

آباؤ اجداد لاہور کے رہنے والے ہیں۔ ان کے والد کی میکلوڈ روڈ پر سینما کی مشینری کی دکان ہے شیخ صاحب نے رائے ونڈ میں چار کنال قطعہ اراضی تقریباً چوبیس سو روپوں میں خرید کر تقریباً ایک لاکھ بارہ ہزار روپیہ کی لاگت سے ناز سینما تعمیر کیا۔ اس سینما کا افتتاح ۲۳ مئی ۱۹۶۹ء کو چودھری عبد محمد ممبر صوبائی اسمبلی پنجاب نے کیا۔ چھ بجے سے نو بجے رات کا شو ہوا اور فلم "سو دن چور دا" دکھائی گئی۔ اس سینما میں ۴۱۸ فلم بینوں کی گنجائش ہے تفصیل یہ ہے:۔

بکس = ۱۸

سٹال = ۹۸

فرسٹ کلاس = ۱۹۴

تھرڈ کلاس = ۸۰

مستورات = ۲۸

میزان = ۴۱۸

عبدالکریم ماسٹر بن میاں چراغ دین بن میاں جلال دین

ماسٹر صاحب کے آباؤ اجداد بابلیانہ کے رہنے والے ہیں۔ جدی پیشہ حکمت ہے....

ماسٹر صاحب کے میاں فیض محمد اور راقم کے والد صاحب سے اچھے تعلقات ہیں۔ راقم سے بڑی محبت سے پیش آتے ہیں

عبدالشکور ڈاکٹر بن میاں عبداللہ

...... ان کے پاس ایک تعریفی سند ہے جس کے مطابق انہوں نے ڈاکٹر غلام سرور بھٹی ایم بی بی ایس کی والدہ کی آنکھ کا علاج کیا تھا۔ ۲۵ مئی ۱۹۶۴ء کو یہ سند ڈاکٹر سرور صاحب نے ان کو دی تھی۔!

عبدالرحمٰن ماسٹر

محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب میں ملازم تھے رائے ونڈ کے ڈی سی ہائی سکول سے ۱۴ اپریل ۱۹۵۳ء کو سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۵۶ء سے دیسی جوتے اور سوکھی کھالیں فروخت کرنی شروع کیں۔

فرمان بیگ مرزا بن مرزا امین بیگ بن

ہوشناک بیگ بن شہاب بیگ

موضع گوریاں ضلع شیخوپورہ میں زمینداری کرتے تھے ۱۸ جون ۱۹۵۱ء کو ریلوے ٹریک سپلائی ڈپو رائے ونڈ میں بطورِ قلی بھرتی ہوئے آج کل آپ لوہار ہیں۔

محمد سعید ماسٹر بن ماسٹر محمد شفیع

.... انجمن خادم المسلمین کوٹ خزاں سنگھ کے تمام کاغذات ان کے پاس محفوظ ہیں۔ مذکورہ انجمن کی ملکیتی اشیاء پانچ دیگیں، ایک بڑی پرات، ایک ٹب

چاول کھانے کی پلیٹیں اور گلاس وغیرہ ان کی تحویل میں ہیں۔

۱۵ر جون ۷۷ء

ـــــــــــــــ غُصّہ بقدرِ جُثّہ

یہ غصہ بہت بری چیز ہے گزشتہ روز ایک صاحب کو ہم نے جھاگ اگلتے پایا، وہ غیض و غضب میں اپنے مخالف کو للکار رہے تھے

"اگر تم نے مجھ سے "متھا" لگایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ میں گوالمنڈی میں رہتا ہوں، میرے سات بھائی ہیں اور ان میں سے ایک کشمیری ہے"

۲۸ر مئی ۱۹۷۶ء

اِک گھر بناؤں گا

میرے ایک صحافی دوست نے جو "صحافت کی سیج" پر زندگی بسر کرنے کے باوجود تاحنوز صرف تنخواہ پر گزارا کرتا ہے، گزشتہ روز سولہ سو ایکڑ سکیم میں دس مرلے زمین کے لیے رقم کی پہلی قسط ایل ڈی اے میں جمع کرائی ہے اور اب تک "تصوّرِ جاناں" میں آنکھیں بند کیے بیٹھا ہے۔ "یہ تصوّرِ جاناں" ذاتی گھر کا تصوّر ہے چنانچہ وہ اس وقت سے مکان کا نقشہ تیار کرنے میں مشغول ہے اور اس کی تعمیر کے ضمن میں دیگر امور پر غور و فکر کر رہا ہے جہاں تک مکان کے نقشے کا تعلق ہے، اس کے لیے وہ کاغذ پر کھینچی اُلٹی سیدھی لکیروں سے زیادہ بنے بنائے مکانات کے "معائنے" کو ترجیح دیتا ہے۔ چنانچہ کل سے وہ اپنے سکوٹر پر گلبرگ وغیرہ کے علاقے میں مارا مارا پھر رہا ہے، اس دوران وہ حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بھی بچا ہے کیونکہ بقول میر درد "دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے" وہ سکوٹر چلاتے وقت دیکھ تو سامنے رہا ہوتا ہے مگر اس کا دھیان دائیں بائیں جانب واقع خوبصورت کوٹھیوں کے نقشے ذہن میں محفوظ کرنے میں مشغول رہتا ہے۔

آج صبح میرا یہ دوست ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا اور کہا :-

"مکان کا مسئلہ حل ہو گیا!"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک ڈیزائن پسند کر لیا ہے۔ بہت کمال کی کوٹھی ہے، اس کے آگے چھ کنال کا لان ہے!"

"وہ تو ٹھیک ہے،" میں نے کہا، "مگر دس مرلے زمین میں چھ کنال کے لان کی گنجائش نکالنا

قدرے مشکل ہو گا"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے روہانسا ہو کر کہا "پھر کیا کیا جائے"؟

"فی الحال تم "آدم جی کی لان" پر گزارا کرو، بعد میں دیکھا جائے گا!"

دس مرلے زمین میں چھ کنال لان والے منصوبے میں کمی بیشی کرتے ہوئے اس نے بالآخر دس فٹ لان پر رضا مندی کا اظہار کیا اور کہا "میرا ارادہ ڈبل سٹوری تعمیر کرنے کا ہے۔ نیچے دو بیڈ روم، ایک ڈرائنگ ڈائننگ، گیراج۔ اور گیراج کے اوپر ایک خوبصورت سا کمرہ، جس میں باہر کی طرف دبیز شیشوں والی کھڑکیاں ہوں۔ !"

"گیراج بنا کر کیا کرو گے اکیلا سکوٹر وہاں پریشان ہو گا!"

"نہیں یار، گیراج ضرور ہونا چاہیئے، اس کا دروازہ بند رکھا کروں گا۔ باہر سے لوگ یہی سمجھیں گے کہ کار اندر کھڑی ہے!"

"تم اگر گیراج کا دروازہ کھلا رکھو، تو بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ لوگ سمجھیں گے کہ کار کہیں باہر گئی ہوئی ہے"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہاں یاد آیا میں باتھ رومز کے معاملے میں بہت حساس ہوں، میں نے سوچا ہے کہ اپنی کوٹھی میں بہت وسیع و عریض باتھ رومز بناؤں گا اور اس میں تمام جدید ترین آسائشیں ہوں گی۔ یہ میری بہت شدید خواہش ہے!"

"یہ آئیڈیا بھی برا نہیں" میں نے کہا "باتھ روم واقعی ایسا ہونا چاہیئے کہ اگر کبھی مہمان زیادہ آجائیں تو ان میں سے کچھ کو باتھ روم میں ٹھہرایا جا سکے!"

وسیع و عریض اور جدید ترین آسائشوں سے آراستہ باتھ رومز کے سلسلہ میں جب میں نے مذکرہ نوع کی "آراء" سے اپنے دوست کو اس پر رضامند کر لیا کہ فی الحال اسے باتھ روم اور ڈرائنگ روم میں ایک ہلکا سا امتیاز قائم رہنے دینا چاہیئے نیز اس امر کا قائل بھی کر لیا کہ عالی شان کوٹھی کی بجائے رہنے کے لیے ایک اوسط درجے کا گھر کافی ہے تو اس نے کہا "چلو میں تمہاری بات مان لیتا ہوں، مگر مکان کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک چھوٹی سی رکاوٹ ہے، کچھ مشورہ اس کے بارے میں بھی دو"؟

"کیا رکاوٹ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پیسہ نہیں ہے!"

"تم نے اس سلسلے میں تخمینہ لگوایا ہے؟"

"ہاں۔ اوسط درجے کا مکان بھی تعمیر کیا جائے تو کم سے کم ڈیڑھ لاکھ روپے لگتے ہیں!"

"پھر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"ساٹھ ہزار روپے ہاؤس فنانس کارپوریشن والوں سے قرض لے لوں گا!"

"اور باقی؟"

"قریباً ۱۵ ہزار روپے کی مالیت کے زیورات ہیں، کچھ قرض یہ زیور رہن رکھنے کی صورت میں مل جائے گا!"

"دس ہزار یہ ہو گئے، باقی؟"

"سکوٹر بیچ دوں گا۔"

"میں نے سکوٹر کی ہیئت کذائی مدِ نظر رکھی اور کہا "دو ہزار روپے — باقی؟"

اس کے چہرے پر سوچ کی لہریں نمودار ہوئیں اور پھر اس نے چٹکی بجا کر کہا "کچھ رقم تم سے قرض لوں گا!"

"ٹھیک ہے" میں نے جواب دیا "سو روپیہ یہ ہو گیا۔ باقی؟"

"تم ٹوٹل لگاؤ" اس نے بیزار ہو کر کہا "پہلے دیکھیں یہ رقم کتنی بنتی ہے؟"

"بہتر ہزار ایک سو!"

"مزید کتنی رقم درکار ہے؟"

"قریبا اتنی ہی رقم اور درکار ہے؟"

"ٹھیک ہے، انتظام ہو جائے گا!" اس نے اچانک پر امید ہو کر کہا

"وہ کیسے" میں نے پوچھا

"میں لائف انشورنس کرا لوں گا!"

"مگر اس سے مکان کیسے بنے گا؟"

"بن جائے گا" اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "انشورنس کرانے کے بعد میں خودکشی

کروں گا۔ اگر میں نہیں تو میرے بچے اپنے مکان میں ضرور رہیں گے!"

۲۴ر جون ۱۹۷۷ء

ـــــــــ صاف جواب

ارشد نے امجد سے پوچھا

" اگر تمہارے پاس دو کاریں ہوں تو کیا کروگے؟"

" ایک کار قوم کی خدمت کے لیے وقف کردوں گا"

" اگر دو بنگلے ہوں؟"

" ان میں سے ایک بنگلہ میں کوئی رفاعی ادارہ قائم کروں گا۔"

" اگر دو فیکٹریاں ہوں؟"

" ایک فیکٹری کی آمدنی یتیموں اور بیواؤں کے لیے وقف کردوں گا۔"

" اور اگر تمہارے پاس دو گائیں ہوں؟"

" دونوں اپنے پاس رکھوں گا!" امجد نے جواب دیا۔

" وہ کیوں؟" ارشد نے حیرت سے پوچھا۔

" وہ اس لیے کہ میرے پاس دو گائیں موجود ہیں!"

۲۵ر جنوری ۷۵ء

بہتی گنگا

بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا ایک محاورہ ہے اور ہم گزشتہ تیس برس سے مختلف ادوار میں اس محاورے کو فقرے میں استعمال ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ متذکرہ محاورے کو فقرے میں استعمال کرنے والے امتحانی نقطۂ نظر سے ایسا نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ طبقہ کبھی کسی امتحان سے نہیں گزرتا۔ بس ہر دور میں بہتی گنگا سے ہاتھ دھونا جانتا ہے جب امتحان کا وقت آتا ہے تو اس طبقے کے لوگ اپنی جگہ کسی اور کو کمرۂ امتحان میں بھیج دیتے ہیں جس کے "نتیجے" میں اگلی "کلاس" میں پہنچ جاتے ہیں چنانچہ جب لگاگرنئی "کلاس" میں شامل ہونے والے اس طبقے کے افراد پھر سے بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے محاورے کو فقرے میں استعمال کرکے دکھاتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیتے ہیں!

لیکن گزشتہ کچھ عرصے میں ایک اور گروہ سامنے آیا جس نے اس معاملے میں پہلے طبقے کے افراد کو بھی مات دے ڈالی ہے یہ وہ گروہ ہے جس نے آغاز بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے سے نہیں کیا۔ بلکہ درمیان کے تمام مراحل بیچ ہی میں چھوڑ کر انہوں نے ایک دم سے بہتی گنگا میں "اشنان" شروع کر دیا ان کے اس اقدام سے عوام کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی چنانچہ وہ جو ہاتھ دھونے پر اکتفا کر رہے تھے انہوں نے ایک ہی جست میں اشنان کی کوششیں شروع کر دیں۔ گنگا ایک تھی اور اس سے مستفید ہونے والوں کی تعداد اس کے کناروں سے بھی بڑھ گئی۔ نتیجتاً دھکم پیل شروع ہو گئی۔ اور پھر جس کا زور چلا اس نے ہاتھ دھو لیے اور جس کا زیادہ

زور چلا اس نے "کپڑے اتارے" اور "اشنان" کر لیا!

اس ضمن میں تازہ ترین صورت حال یہ تھی کہ لوگ اشنان کی توقع میں پہلے ہی کپڑے اتار دیتے تھے چنانچہ اس عرصے میں بڑے بڑے معززین کو دیکھا گیا کہ وہ ننگ دھڑنگ قطار میں کھڑے ہیں اور اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں بلکہ بعض ایک کو تو باقاعدہ دھکم پیل کرتے پایا گیا۔ ان میں سے کئی ایک ساحل سے ریت اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھونکتے تھے۔ کیچڑ اچھالتے تھے تاکہ اشنان میں سبقت لے سکیں چنانچہ جنہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی تھی وہ کپڑے پہن کر معززین کی صف میں شامل ہو جاتے تھے اور جنہیں اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی تھی وہ ننگ دھڑنگ اپنی جگہ پر کھڑے لوگوں کی چبھتی نظروں کا نشانہ بنتے اور اس وقت کا انتظار کرتے جب بہتی گنگا سے ہاتھ دھونے یا اشنان کرنے کے بعد وہ اپنی برہنگی چھپا سکیں اور پھر عزت مآب کہلائیں!

یہ سب لوگ فائدے میں رہے ہیں کیونکہ انہوں نے جلد یا بدیر اپنے برہنہ جسم کو خلعتوں میں چھپا لیا اور شرفاء میں شمار ہونے لگے لیکن ایک طبقہ ایسا ہے جس کے ساتھ بہت ٹریجڈی ہوئی ہے اور ان کی حالت زار دیکھ کر دل خون کے آنسو بہاتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اگرچہ اشنان کے لیے بہت عرصہ سے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور اس کے لیے انہوں نے لاکھوں لوگوں کے سامنے کپڑے بھی اتار پھینکے تھے مگر ان کی باری کچھ عرصہ پیشتر آئی چنانچہ انہوں نے فرطِ مسرت سے بہتی گنگا میں غوطہ لگایا اور اشنان سے فراغت کے بعد جب کپڑے پہننے اور یوں معززین کی صف میں شامل ہونے کے لیے ساحل کی طرف بڑھے تو انہوں نے دیکھا کہ کوئی ستم ظریف ان کے کپڑے اٹھا کر لے گیا ہے نہ صرف یہ کہ ان کے کپڑے وہاں سے غائب ہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں عوام ساحل پر کھڑے ہیں اور انہیں دیکھ کر اپنی دو انگلیوں سے سیٹیاں بجا رہے ہیں اور قہقہے لگا رہے ہیں اِدھر گنگا کا پانی بھی اتر گیا ہے اور یوں یہ معززین دونوں ہاتھوں سے اپنی برہنگی کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں سو اب صورت حال یہ ہے کہ عوام انہیں دیکھ کر سیٹیاں بجا رہے ہیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے برہنگی چھپانے میں مشغول ہیں نہ ان سے پانی کے اندر کھڑا ہوا جاتا ہے اور نہ وہ باہر آ سکتے ہیں۔

۲۱ جولائی ۷۷ء

کوڑھ کرلی !

پشاور کے ایک ہوٹل میں رات کو زم نرم بستر پر دراز ہوتے ہوئے میری نظریں چھت کیطرف اٹھیں تو اپنے سر کے عین اوپر ذات کی ایک کوڑھ کرلی (چھپکلی) کو شہتیروں سے بچھے ڈالتے دیکھا، میں ہڑ بڑا کر چارپائی سے اٹھ بیٹھا اور سامنے کرسی پر جا کر بیٹھ گیا میرا دوست سونے کی تیاریاں کر رہا تھا، اس نے میرے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھیں تو آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"چھپکلی!" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو تم گویا چھپکلی سے ڈرتے ہو" اس نے چھت کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے ہنس کر کہا "آرام سے سو جاؤ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گی، اس نے "فوڈ پائزننگ" نہیں کرانی!"

"میں کوڑھ کرلی سے ڈرتا نہیں ہوں" میں نے ڈرتے ڈرتے صورتحال کی وضاحت کی۔ "مجھے اس سے شدید کراہت محسوس ہوتی ہے اور جب تک یہ کمرے میں موجود ہے میری آنکھوں میں نیند نہیں اتر سکتی"۔

"تم ادھر میری چارپائی پر آجاؤ! میں تمہاری جگہ سو جاتا ہوں!"

"ایک دوسرے کی جگہ بدل کر سونے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ مسئلہ جاگنے سے حل ہو گا پتہ نہیں یہ کس وقت چھت سے سیدھی منہ میں آگرے اور پھر تم نہ اسے نگل سکو اور نہ اگل سکو!"

"آخ تھو!" دوست نے اپنے بستر سے چھلانگ لگائی اور ملحقہ غسل خانے میں تھوکنے کے لیے

لپکا "تم بہت غلط آدمی ہو خواہ مخواہ مجھے بھی کانشس (CONSCIOUS) کر دیا ہے"!

میں نے دزدیدہ نگاہوں سے ایک بار پھر چھت کی طرف دیکھا کوڑھ کرلی بلب کے گرد جمع پروانوں پر نظریں جمائے بیٹھی تھی وہ انہیں غافل پا کر اچانک ان کی طرف لپکی اور ایک پروانے کو نگل لیا اس کا پیٹ پھولا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ کافی دیر سے اس مشغلے میں مصروف ہے!

"پھر اب کیا کیا جائے!" مجھ سے زیادہ اب میرے دوست کو تشویش لاحق ہو گئی تھی وہ غسل خانے میں جا کر تھوکنے کے بعد سے اپنے بستر پر اکڑوں بیٹھا تھا!

"اسے کمرے سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں" میں نے نظریں اِدھر اُدھر دوڑا کر کوئی چیز تلاش کرتے ہوئے کہا لیکن کمرے میں بجز ہمارے اٹیچی کیسوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

"ہش ہش" دوست نے مایوسی کے عالم میں منہ سے آوازیں نکال کر چھپکلی کو بھگانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنے کریہہ ہاتھ اور ٹانگیں چھت پر مضبوطی سے جمائے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں پروانوں پر جمائے ہوئے تھی۔

"غڑاپ" اس نے ایک اور پروانہ نگل لیا تھا اور اب وہ اپنی سرخ سرخ زبان باہر نکال رہی تھی۔

میں نے کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد دزدیدہ نظروں سے کوڑھ کرلی کو دیکھ لیتا تھا۔ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس کی موجودگی میں نرم نرم بستر پر دراز ہو جاؤں!

"ہش۔ ہش" اب کے دوست نے ہوائی چپل اٹھالی تھی اور اسے دیوار کے ساتھ بجا بجا کر کوڑھ کرلی کو ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن چھپکلی اس صورت حال سے بے نیاز اپنے شکار میں مشغول تھی!

دوست نے کمرے میں بڑی تپائی کو بستر پر رکھا اور اس پر چڑھ کر زیادہ قریب سے اسے بھگانے کی کوشش کی اس کی یہ کوشش قدرے کامیاب ہوئی کیونکہ چھپکلی نے ایک جست لگائی اور تیزی سے کمرے کے ایک حصے سے دوسرے حصے کی طرف چلی گئی۔

اب وہ اپنے گول گول دیدے اِدھر اُدھر گھما کر صورت حال کا جائزہ لے رہی تھی تاہم اس

دوران اس نے ایک اور پروانہ شکار کر لیا تھا،

"اب کیا کیا جائے؟" دوست نے چپل کو زمین پر رکھتے ہوئے ایک طویل جماہی لی اور کہا "یہ تو ابھی تک کمرے ہی میں ہے!"

"ایک دفعہ پھر کوشش کی جائے" میں نے جواب دیا "میں جانتا ہوں تم سارے دن کے طویل سفر سے تھکے ہوئے ہو اور تمہاری آنکھوں میں نیند تیر رہی ہے، لیکن اگر تم سو گئے تو یہ چھت سے سیدھی تمہارے منہ میں...."

"آخ تھو" اس نے بُرا سا منہ بنایا اور ایک پھر تھوکنے کے لیے غسل خانے کی طرف دوڑا

اب کے میں نے چپل اٹھائی اور اسے دیوار کے ساتھ بجاتے ہوئے کرلی پر یلغار کر دی، وہ خوف زدہ ہو گئی تھی اور اس نے تیزی سے اِدھر سے اُدھر بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ روشن دان کے رستے باہر نکل جائے لیکن اسے اپنے اردگرد پروانے نظر آ رہے تھے جنہیں اس نے ابھی شکار کرنا تھا چنانچہ وہ گھوم پھر کر ایک جگہ آن کھڑی ہوتی تھی اور اپنے مکروہ پاؤں اس خوبصورت کمرے کی چھت اور دیواروں میں گاڑ دیتی تھی اس کی مکار آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا اور وہ بار بار اپنی زبان باہر نکالتی تھی۔!

"رک جاؤ!" میرے دوست نے میری سانس پھولی دیکھی تو کہا "ہم کمرے کی بتی بند کر دیتے ہیں۔! یہ خود بخود باہر نکل جائے گی۔!"

"وہ اندھیرے میں اپنا شکار زیادہ مہارت سے کرے گی اور دوسری طرف ہم اس سے غافل ہو جائیں گے۔ یہ بتی جلتی رہنی چاہیئے اندھیروں میں آسیب پلتے ہیں!" میں نے کہا

"تو پھر یوں کرتے ہیں۔ روشن دان اور کھڑکیاں بند کر کے چپل سے اس کا نشانہ لیتے ہیں بعد میں اسے دم سے پکڑ کر باہر پھینک دیں گے!"

"یہ تم کیسی باتیں سوچ رہے ہو" مجھے متلی سی محسوس ہوئی "ہم نہ اسے نشانہ بنائیں گے اور نہ روشن دان اور دریچے بند کریں گے روشن دان کھلے رہنے چاہئیں، تازہ ہوا آتی رہنا چاہیئے۔"—

"تو پھر کیا کیا جائے؟" اس نے روہانسا ہو کر پوچھا

"کچھ بھی نہیں، سوائے اس کے کہ اسے کمرے سے نکالا جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اسے

گھیر گھار کر روشن دان کی طرف لاؤ اور میں اسے روشن دان سے باہر کی طرف دھکیل دوں گا۔ ہم دونوں کی مشترکہ کوشش سے یہ کمرہ کوڑھ کرلی سے چھٹکارا حاصل کرلے گا۔!"

"ٹھیک ہے!" دوست نے چپل ہاتھ میں لی۔ "تم دوسری طرف کھڑے ہو جاؤ۔ اس بار یہ کمرے سے باہر نظر آنی چاہیے"

کچھ دیر بعد چھپکلی واقعی کمرے سے باہر تھی۔ ہم اطمینان سے اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئے۔

"یار! ایک بات تو بتاؤ۔" میرے دوست نے خالی چھت کی طرف سکون بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ پروانے اتنے نادان کیوں ہیں۔؟ چھپکلی کتنی دیر تک ایک ایک کرکے انہیں نگلتی چلی گئی ہے لیکن وہ اس کے باوجود غافل رہے ہیں اور اس کا شکار ہوتے چلے گئے!"

"یہ کمال چھپکلی کا نہیں بلب کا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پروانے اس کی چکا چوند کے اسیر رہے اور کوڑھ کرلی اپنے کام میں مشغول رہی۔ شکار کی آنکھیں مصنوعی روشنی سے خیرہ کر دی جائیں تو وہ باآسانی شکار ہو جاتا ہے۔"

"خیر چھوڑو۔" دوست نے بستر پر ٹانگیں پسارتے ہوئے مسکرا کر کہا "آج بہر حال یہ پتہ ضرور چل گیا کہ کوڑھ کرلی دیکھ کر تمہاری گھگی بندھ جاتی ہے۔"

"میں کوڑھ کرلی سے نہیں ڈرتا۔" میں نے ایک بار پھر سہمی سہمی دزدیدہ نگاہوں سے درو دیوار کا جائزہ لیا "میں کوڑھ سے ڈرتا ہوں۔ میں نے کوڑھیوں کو دیکھا ہے وہ اپنے ہاتھوں پر زخم سجا کر بازاروں میں بھیک مانگتے ہیں۔ ہم اپنے ہاتھوں پر زخم سجا کر بازاروں میں بھیک نہیں مانگیں گے۔ ہم یہ کوڑھ کرلیاں نہیں پلنے دیں گے۔!"

۱۷ اگست ۱۹۷۷ء

تمہارے راستے میں روشنی!

پشاور میں ایک روزہ قیام کے دوران درّہ آدم خیل کی سیر کے لیے افتخار عارف، عبیداللہ بیگ، محسن احسان ایوب صابر اور میرے رفیق پروفیسر احمد حسن حامد ایک "سالم" ویگن میں بیٹھے اور پھر باریش پٹھان ڈرائیور نے اس کا رُخ درّے کی طرف موڑ دیا۔ افتخار عارف اور عبیداللہ بیگ "کسوٹی" پروگرام کی ریکارڈنگ کے لیے کراچی سے یہاں آئے ہوئے تھے ہماری ان سے ملاقات کنور آفتاب کے کمرے میں اچانک ہوگئی تھی اور ایوب صابر اس پروگرام میں مہمان کی حیثیت سے شرکت کے لیے کوہاٹ سے پشاور پہنچے تھے درّے سے انھوں نے کوہاٹ چلے جانا تھا اور ہم دوستوں کا پروگرام درّے سے واپس پشاور آنے کا تھا۔

قریباً پندرہ بیس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہماری ویگن آفریدیوں کے علاقے درّہ آدم خیل میں داخل ہوگئی آزاد علاقے کی حدود شروع ہوچکی تھیں۔ محسن احسان نے بتایا کہ یہاں پاکستان کا قانون نافذ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر کسی کو قتل کرکے یہاں پھینک دیا جائے تو پولیس کوئی مداخلت نہیں کرسکتی۔ یہ بات پہلے سے ہمارے علم میں تھی اور ہم اسے یاد کرکے خواہ مخواہ اپنے رونگٹوں کو زحمتِ ایستادگی نہیں دینا چاہتے تھے سو محسن احسان ہم پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا لیکن وہ یہ احسان کرچکے تھے ہمیں تو چپ لگ گئی۔ البتہ افتخار عارف نے یہ سن کر مسرت کا اظہار کیا اور محسن سے کہا "تو پھر ہم کراچی کے کچھ شاعر آپ کے پاس بھیجیں گے۔ آپ براہ کرم انہیں یہاں چھوڑ جائیں"

ویگن اپنی منزل کی جانب بڑھتی جارہی تھی۔ پہلے ہمارے دونوں جانب پہاڑ تھے اب سامنے

بھی پہاڑ تھا اور ہم نے پیچھے نظر ڈالی تو سڑک کہیں بیچ میں گم ہو گئی تھی اور وہاں بھی سر سبز پہاڑ کسی غیور پٹھان کی طرح سینہ تانے کھڑے تھے۔

پختون ادیب ایوب صابر نے کہا "فرنگیوں نے پٹھانوں کو غلام بنانے کے لیے کئی حربے آزمادیکھے، مگر وہ اپنی کسی چال میں کامیاب نہ ہوئے۔ یہ جو آپ کو یہاں پکی سڑک نظر آرہی ہے تو یہ پاکستان کی کرامت ہے دیگر صوبوں کے مسلمانوں کی طرح پٹھانوں کو بھی قیام پاکستان سے بہت فائدہ پہنچا ہے۔ اب یہاں کے لوگ خاصے خوشحال ہیں اس آزاد علاقے میں اب لڑکوں کا کالج ہے۔ ہائی سکول ہیں اور لڑکیوں کے لیے ایک پرائمری سکول بھی ہے" میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا تو نئے اور پرانے ماڈل کی کاریں، سوزوکیاں اور موٹر سائیکل فراٹے بھرتے ہوئے ہمارے قریب سے گزر رہے تھے عبیداللہ بیگ ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھے سر خوشی کے عالم میں ایک کھلنڈرے بچے کی طرح پکے کچے گھروندوں اور سر سبز و شاداب پہاڑوں کے نظارے میں محو تھے۔ افتخار عارف ہم سفروں کو نئی نسل کے معروف اور غیر معروف شعراء کا کلام سنانے میں مشغول تھے۔ ایسا کرتے وقت انہیں دھڑا یاد نہیں رہتا تھا، صرف اچھا شعر یاد رہتا تھا ادب اور ادیبوں کے ضمن میں اتنی بے تعصبی میں نے ذرا کم ہی دیکھی ہے ان کی زبان سے کراچی کے نوجوان اور بعض کم سن شعرا کے یکسر نئی سینسیبیلٹی کے حامل متعدد اشعار سن کر احساس ہوا کہ یہ شہر ایک بالکل نئی شاعری کی لہر میں ہے۔! وجد اور سرشاری کے عالم میں اشعار سناتے سناتے وہ ایک دم خاموش ہو گئے انہوں نے ایک نظر بلند و بالا پہاڑوں پر ڈالی جن کے دامن میں کھڑے لوگ بونے بونے سے لگ رہے تھے اور کہا "عطا بھائی"۔! یہ مولانا احتشام الحق تھانوی اور فیض احمد فیض کیا ہیں۔؟ جب کوئی نئی حکومت آتی ہے مولانا احتشام الحق امام ضامن اور فیض احمد فیض کلچر پہن کر اس کے حضور پہنچ جاتے ہیں"! اور اس کے بعد انہوں نے دوبارہ اسی سرشاری کے عالم میں شعر سنانا شروع کر دیئے۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد اچانک یوں محسوس ہوا جیسے چاروں طرف سے لوگ اپنے مکانوں سے نکل کر سڑک پر جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کے گلے میں رائفلیں اور کارتوسوں سے بھری ہوئی پیٹیاں تھیں اور وہ سینہ تانے تیز تیز قدم اٹھاتے کھنچے ہوئے چہروں کے ساتھ ایک

ہی جانب رواں تھے۔ ویگن کے باریش ڈرائیور نے خطرے کی بو سونگھی اور کہا "کچھ گڑبڑ ہے" جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے ہمیں دو دو چار چار کی ٹولیوں میں قبائلیوں کے گروہ دکھائی دیتے جن کے چہروں پر ناراضگی کے آثار تھے اور وہ مسلح ہو کر سڑک کے کنارے کنارے چلتے سامنے کی جانب جا رہے تھے بعض ٹولیوں میں ایک ایک دو دو عورتیں بھی تھیں جنہوں نے کھلے کھلے لباس پہن رکھے تھے ایک بڑی حویلی کے باہر سینکڑوں لوگ کھڑے تھے اور انہوں نے اپنی بندوقیں گلے میں ڈالی ہوئی تھیں راستے میں جو قبائلی ہمیں ملے تھے وہ بھی ٹولیوں کی صورت میں جمع ہو رہے تھے ڈرائیور نے یہاں پہنچ کر بریک لگائی اور مجمع میں سے ایک شخص کو پاس بلا کر صورت حال دریافت کی تھوڑی دیر تک وہ دونوں پشتو میں گفتگو کرتے رہے اور پھر ڈرائیور نے ویگن کو اس کی منزل کی طرف ڈال دیا۔

" معمولی بات ہے" ڈرائیور نے گیئر بدلتے ہوئے کہا "یہاں ایک گھر میں جوا ہوتا تھا۔ علاقے کے لوگوں نے اسے منع کیا وہ باز آگیا مگر کچھ دنوں بعد اس نے پھر سے یہ کام شروع کر دیا اس پر لوگوں نے اسے پکڑ کر جرگے کے سپرد کر دیا۔ اب اس حویلی میں جرگہ بیٹھا ہوا ہے اور لوگ فیصلہ سننے کے لیے جمع ہو رہے ہیں"۔

"آپ کو شاید ایک بات کا علم نہیں ہے" ڈرائیور نے بات ختم کی تو ایوب صابر نے اپنا بیان شروع کیا "یہ اگرچہ آزاد علاقہ ہے لیکن یہاں کے قوانین بہت سخت ہیں۔ اس علاقے میں بہت کم زنا کی واردات ہوتی ہے کیونکہ زنا کے مرتکب کو شدید ترین سزا دی جاتی ہے، اسے قتل کر دیا جاتا ہے اور بعض صورتوں میں اس کے مکان کو بھی آگ لگا دی جاتی ہے" ایک بار پھر ویگن میں خاموشی طاری ہو گئی!

دریں اثنا، ہم درّے کے ایک بارونق بازار میں پہنچ گئے تھے۔ ایوب صابر کو یہاں سے کوہاٹ کے لیے بس پکڑنا تھی جو یہاں سے صرف چند میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ہمارا ارادہ ابھی مزید کچھ دور جانے کا تھا۔ مگر شام ہونے کو تھی اور ہمیں ابھی پشاور پہنچنا تھا۔ سو ہم نے ایوب صابر کو یہاں اتارا اور واپس لوٹنے ہی کو تھے کہ پٹھانوں کے روایتی لباس میں ملبوس ایک نوجوان نے کھڑکی میں سے اندر جھانکا، یوں لگتا تھا وہ کسی کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے اور ہم نے جان لیا کہ اس کی توجہ کا محور افتخار عارف اور عبید اللہ بیگ تھے ٹی وی دیکھنے والے اس قبائلی نے بالآخر انہیں پہچان

لیا تھا اور پھر اس نے محبت آمیز ضد کر کے ہمیں ویگن سے اتارا اور ہمیں قہوہ پلانے کے لیے اپنی دوائیوں کی دکان پر لے گیا۔ بازار میں سے گزرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ دکانوں پر تمام بورڈ اردو میں لکھے ہوئے تھے یا کہیں کہیں انگریزی نظر آتی تھی ایک حیرت انگیز منظر میں نے یہ دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک تخت پوش پر کوکا کولا کے کریٹ پڑے ہوئے تھے اس کے قریب پیسے ڈالنے کے لیے لکڑی کا بنا ہوا ایک بکس دھرا تھا۔ تخت پوش کے برابر والی دیوار پر لکھا تھا۔ "بوتل پی کر پیسے بکس میں ڈال دیں۔ اگر کوئی پیسہ ڈالے تو بھی فائدہ، نہ ڈالے تو بھی فائدہ" اس کے نیچے "ضربت خاں" لکھا ہوا تھا۔ جو اس دکان کا "غائبانہ" مالک تھا۔ میں نے یہ منظر "مہذب" بستیوں میں بھی بہت کم دیکھا تھا!

چینی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گول پیالوں میں ہم نے قہوے کی چسکیاں لینا شروع کیں اور چاروں طرف سے سرسبز پہاڑوں میں گھری ہوئی اس وادی کی فضاؤں میں کھو گئے سورج پہاڑوں کی اوٹ میں غروب ہو رہا تھا اور ہر طرف شفق کے رنگ بکھر گئے تھے فطرت کی ان دم بخود خاموشیوں میں تھوڑی دیر بعد فضا میں ایک جانب سے کارتوس چلنے کے باعث ارتعاش سا پیدا ہوتا، جس کے کچھ دیر بعد پہاڑوں میں اس کی بازگشت سنائی دیتی اور پھر خاموشی چھا جاتی، دکان کے پچھواڑے میں ایک شادی تھی اور یہ فائرنگ اس تقریب کا روایتی حصہ تھی!

خلوص آمیز قہوے کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ہم نے میزبانوں سے ہاتھ ملایا اور واپس پشاور جانے کے لیے ویگن میں سوار ہو گئے ایک نوجوان بھی ہمارے ساتھ آن بیٹھا تھا اس نے راستے میں اتر جانا تھا۔ ایک بار پھر خوبصورت راستوں سے گزرتے ہوئے میں نے اپنے لوگوں کی اس سرزمین کو محبت سے دیکھا اور اس کے ایک ایک منظر کو آنکھوں میں سجا لیا۔ سڑک کے کنارے کھلے میدان میں ایک قبائلی اپنے خدا کے حضور سجدہ ریز تھا اور اس کی پیشانی خاک میں اٹی ہوئی تھی ڈرائیور نے راستے میں ایک جگہ بریک لگائی۔ نوجوان کو یہیں اترنا تھا۔ اس نے ہم سے باری باری مصافحہ کیا اور "تمہارے راستے میں روشنی" کہہ کر چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا "تمہارے راستے میں روشنی!" میرے ہونٹوں سے بھی یہ الفاظ ادا ہوئے اور پھر مجھے چاروں پہاڑوں میں اس کی بازگشت سنائی دی "تمہارے راستے میں روشنی۔ تمہارے راستے میں روشنی!"

مجھے یوں لگا یہ دعائیہ الفاظ پھول کی پتیوں کی طرح میرے وطن کی فضاؤں میں پھیل گئے ہیں۔!

۲۲ر اگست ۱۹۷۷ء

سگریٹ سے پائپ تک

سگریٹ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ سگریٹ کے ساتھ ماچس آتی ہے، کھانسی آتی ہے اور کئی بزرگوں کی مصنوعی بتیسی بھی باہر آجاتی ہے، پائپ کا معاملہ بھی کچھ اس سے مختلف نہیں۔ کیونکہ سگریٹ کے ساتھ ماچس آتی ہے تو پائپ کے ساتھ ماچیس آتی ہیں "صاحبی" آتی ہے ہم ایک ایسے پائپ نوش کو جانتے ہیں جو ہر ہفتے سو کا نوٹ جیب میں ڈال کر نکلتے ہیں اور اس میں سے پچیس روپے کا تمباکو اور پچھتر روپے کی ماچیس خرید کر گھر لوٹتے ہیں۔ پائپ پینے سے ان کے منہ کا جغرافیہ بدل گیا ہے یا یوں کہہ لیں کہ بگڑ گیا ہے۔ بعض دوستوں کے نزدیک اس کی وجہ پائپ نہیں بلکہ وہ انگریزی ہے جو پائپ منہ میں رکھ کر بولنا پڑتی ہے۔ گویا پائپ کے ساتھ انگریزی بھی آتی ہے۔ چہرے میں جغرافیائی تبدیلیاں بھی آتی ہیں

۸ر دسمبر ۷۶ء

سورج کے مقابل!

فضلے مکینک نے سکوٹر کے سوئچ کو "ٹو" کر دیکھا اور کہا "صاحب جی! آپ کو نیا سوئچ لگوانا پڑے گا، جو پچانوے روپے میں ملے گا۔ میں آپ کو کنکشن جوڑ دیتا ہوں، بس اتنا ہے کہ لائٹ دن کو بھی آن رہے گی لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے جی۔ کام ہی تو چلانا ہے!"

اور پھر اس نے تاریں جوڑ جوڑ کر نٹ بولٹ کسے اور ایک دوسرے ملبر بیٹے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے سکوٹر کو کک لگائی اور میکلوڈ روڈ سے میو ہسپتال کی طرف ہو لیا، جہاں مجھے ایک مریض کی عیادت کرنا تھی ابھی میں دس قدم ہی گیا تھا کہ سامنے سے آنے والے ایک سکوٹر سوار نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے مجھے سکوٹر کی لائٹ آن ہونے کا اشارہ دیا میں نے ہاتھ لہرا کر اس سکوٹر سوار کا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا تھوڑی ہی دیر بعد سامنے والی ایک کار نے اپنی رفتار آہستہ کی اور پھر ڈرائیور نے اپنا ہاتھ باہر نکال کر مجھے جلتی بتی کی طرف متوجہ کیا۔ میں نے گردن کے اشارے سے اطلاع دی کہ میں اس مذموم حرکت سے آگاہ ہو گیا ہوں اور اس کے سدِباب کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لاؤں گا۔ ہال روڈ سے دائیں جانب مڑنے کے لیے مجھے ٹریفک سگنل کے بند ہونے کے انتظار میں کچھ دیر کے لیے رکنا پڑا۔ میں نے سگنل کے دوسری طرف کھڑے سکوٹروں، رکشوں، اور کاروں پر یونہی ایک نظر ڈالی تو دیکھا ان سب نے اپنے اپنے ہاتھ باہر نکالے ہوئے تھے اور انگلیوں کو کھولتے بند کرتے ہوئے مجھے سکوٹر کی لائٹ آن ہونے

کے بارے میں مطلع کر رہے تھے میں نے گھبرا کر سکوٹر کو گیئر میں ڈالا اور سگنل کے سبز ہونے کا انتظار کئے بغیر تیزی سے دائیں جانب کو مڑ گیا۔

اپنے عزیز کی عیادت سے فارغ ہو کر میں واپس سکوٹر سٹینڈ پر آیا اور ٹھیکیدار کو ٹوکن اور پیسے دے کر میں نے سکوٹر سٹارٹ کیا، جس کے ساتھ ہی لائٹ بھی آن ہو گئی۔ ٹھیکیدار نے کہا "بابو جی! بتی جل رہی ہے۔" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور فل تھروٹل دے کر سکوٹر کو اپنے گھر کی جانب ڈال دیا۔ میو ہسپتال کے دروازے سے بائیں جانب کو مڑتے ہی ایک سائیکل سوار اپنا ایک ہاتھ منہ کے گرد رکھ کر زور سے چلایا۔ "بتی!" میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور ہال روڈ سے ہو کر شاہراہ قائد اعظم پر آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں دنیا کا احمق ترین آدمی ہوں اور ہر شخص مجھے دیکھ کر ہنس رہا ہے۔ چنانچہ میں نے سامنے سے آنے والے ٹریفک کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور کانوں پر مہر لگا دی۔ تیزی سے قریب سے گزرنے والے لوگ مسلسل اپنا "فریضہ" انجام دینے میں مشغول تھے مگر اب مجھے ان کی پرواہ نہیں تھی چیئرنگ کراس کے قریب ٹریفک سگنل ایک بار پھر لال لال نظر آیا۔ غالباً اسے بھی میری لائٹوں کا آن ہونا کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ اتنی دیر میں ایک سکوٹر سوار تیزی سے آیا اور اس نے اپنا سکوٹر میرے برابر میں کھڑا کر دیا۔ "آپ بہت ریش ڈرائیونگ کرتے ہیں اگر بتی سرخ نہ ہوتی تو آپ نکل گئے تھے۔" اس نے اپنی عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا "میں نے پیچھے سے مسلسل ہارن دیئے مگر آپ نے توجہ ہی نہیں کی میں آپ کو بتانا چاہتا تھا کہ آپ کی لائٹ آن ہے۔"

مزنگ چونگی تک پہنچتے پہنچتے میرے اعصاب جواب دے گئے کیونکہ اب پیدل چلنے والوں نے بھی میرے ساتھ اشارے بازی شروع کر دی تھی۔ ایک سکول میں چھٹی ہوئی تھی اور بچے بستے بغل میں دبائے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے، میں نے سکوٹر کی رفتار تیز کر دی، میرے ذہن میں یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں یہ بچے میرے پیچھے "بھکڑی" لگائے ہوئے "پاگل ای اوئے پاگل ای اوئے" کا کورس شروع نہ کر دیں۔ ایل او ایس کے قریب سامنے سے آتے ہوئے میرے ایک دوست نے اشارے سے مجھے روکا اور کہا "میں اس وقت جلدی میں ہوں، تم سے

پھر ملاقات ہو گی، لیکن دن کے وقت بتی جلانے کا کیا تُک ہے۔"؟

اب میرے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ میں نے شدید جھنجھلاہٹ کے عالم میں سکوٹر واپس موڑا اور پوری رفتار سے میکلوڈ روڈ واپس پہنچ گیا فضل ایک سکوٹر کی اوور ہالنگ میں مشغول تھا۔ میں نے مضمحل انداز میں اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا "میں سکوٹر یہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اس کی لائٹ کی تاریں ڈس کنکٹ کر کے نیا سوئچ ڈال دو۔ میں کل لے جاؤں گا۔"

"کیوں کیا بات ہے؟" فضل نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

"نہیں!" میں نے اپنی جبیں سے عرقِ ندامت پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "لوگ بہت حساس ہو گئے ہیں چھوٹی روشنیوں نے انہیں بہت دیر تک اندھیرے میں رکھا ہے، اب وہ سورج کے سامنے بے نور چراغ نہیں جلنے دیتے!"

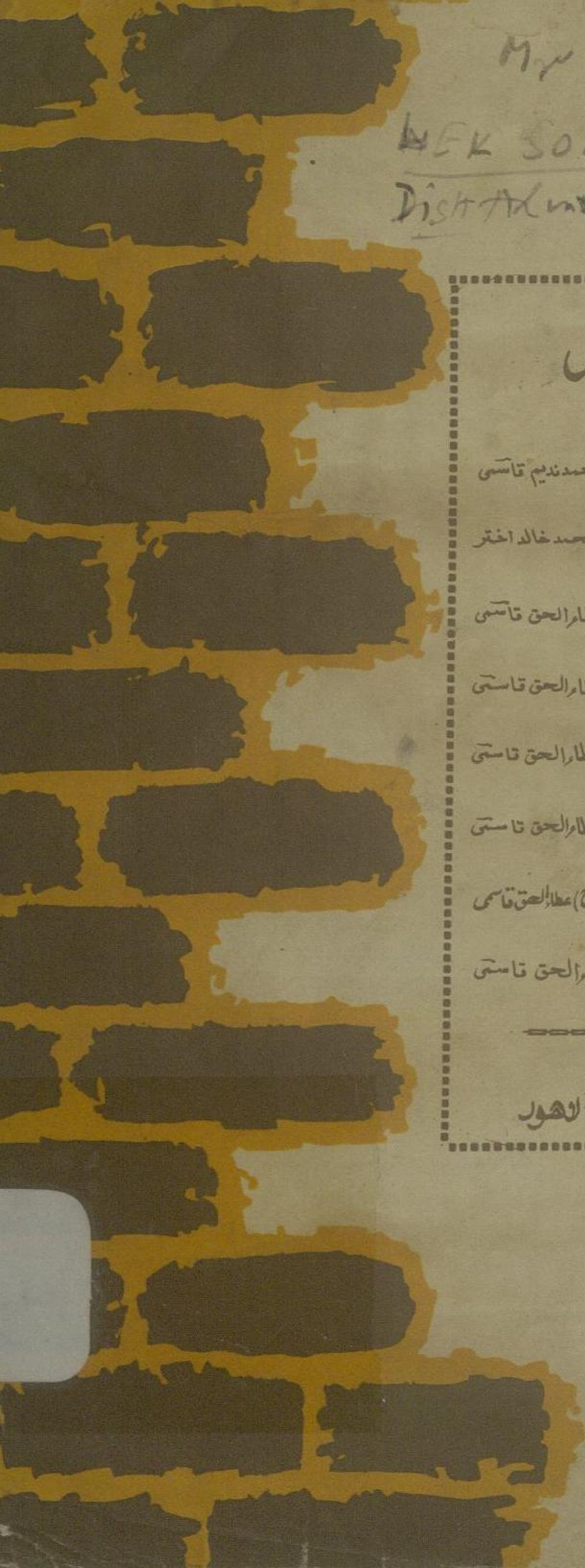
[م جھ ر ل]

۲۹ر اگست ۷۷ء

بصارت

عینک ایک ایسی چیز ہے جو اگر بصیرت نہیں تو بصارت ضرور دیتی ہے اور موجودہ دور میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ انسان بصیرت کی بجائے بصارت ہی پر اعتماد کرے

۲۲ر دسمبر ۷۶ء



آئندہ کتابیں

کپاس کا پھول	(افسانے)	احمد ندیم قاسمی
عودِ پاک	(طنز و مزاح)	محمد خالد اختر
شوقِ آوارگی	(سفرنامہ یورپ)	عطاء الحق قاسمی
مسافتیں	(سفرنامہ بھارت)	عطاء الحق قاسمی
امریکہ اوہ! امریکہ!	(سفرنامہ امریکہ)	عطاء الحق قاسمی
مزید گنجے فرشتے	(خاکے)	عطاء الحق قاسمی
ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامۂ لاہور	(طنز و مزاح)	عطاء الحق قاسمی
آشوبِ ہوا	(شاعری)	عطاء الحق قاسمی

مطبوعات ۱۹ اے نسبت روڈ لاہور